ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اردو ناول میں تہذیبی کردار نگاری (فسانۂ آزاد، امراؤ جان ادا اور کئی چاند تھے سر آسماں کے تناظر میں)

1. نمرہ حنیف
2. ڈاکٹر شائستہ حمید خان
3. راؤ محمد عمر
4. ایمن وکیل

Abstract:

Urdu novel as a developed genre of literature depicts many aspects and perspectives of individual's life and social themes and issues. The Urdu novels Fasaana-e-aazad by Ratan Nath Sarshar, Amrao Jaan ada by Mirza Hadi Ruswa and Kayi chaand thy sar- e- aasman by Shams Ur Rehman Farooqi depict many cultural and social themes. These novels are the best example of strong fictional and real character building in Urdu novel's tradition. By these charaters, the writers of these novels have depicted many historical, cultural and traditional facts and details.

Keywords: *Urdu novel, characters , culture and civilization, social norms, traditions, Depiction of society local, consciousness ethnicity, historical events*

ادب اور تہذیب کا تعلق آپس میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر زبان کسی نہ کسی تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے اور زمانی شعور کے ساتھ ساتھ زمانی تفہیم و معانی کا سلسلہ بھی رکھتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ادب کی کسی بھی صنف کی حقیقی تفہیم کے لیے اسے اس دور کی تہذیب کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ ناول اور خصوصی طور پر کرداری ناولوں میں تہذیبی عناصر اور تہذیبی کردار نگاری کے حوالے سے بات کرنے اور کوئی رائے قائم کرنے سے قبل ہمیں تہذیب کی تعریف و معانی، محرکات و عناصر اور ادب اور تہذیب کے باہمی رشتے کو سمجھ لینا چاہیے۔ اردو میں تہذیب کے معنی آراستگی، صفائی، اصلاح، شائستگی، خوش اخلاقی، رنگ، کلچر (Culture) کے ہیں۔ جب کہ فیروز اللغات اردو جامع کے مطابق کلچر (ثقافت) کے معانی یہ ہیں:

"ثقافت۔ تہذیب، ترقی، زراعت، کاشت، کھیتی۔" [1]

اردو کے علاوہ انگلش میں بھی تہذیب و ثقافت یعنی Culture and Civilization بہت عرصہ تک ایک ہی چیز کے لئے استعمال ہوتے رہے اور ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیے جاتے رہے۔ لیکن اب سماجیات کے ماہرین (Socialogists) نے دونوں کو الگ الگ معانی میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ جہاں ان کے مطابق تہذیب اور ثقافت کی مثال ایسے ہے کہ زبان ثقافت ہے اور تہذیب وہ ملک ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے۔ یعنی ثقافت، تہذیب کا حصہ ہوتی ہے اور تہذیب کو بڑی سطح پر اور کثیر الجہات حیثیت دے دی گئی ہے۔ تہذیب (Civilization) اور ثقافت (Culture) کی تعریف انگریزی میں یوں کی گئی ہے:

"-The stage of human social development and organiztion which is considered most advanced. It includes the society, culture, way of life of a particular area, customs, norms, nation, people and community etc." [2]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ تہذیب اور ثقافت (Culture) عام طور پر ہم معنی اور مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لہٰذا کلچر کی تعریف جاننا بھی ضروری ہے۔ جو کہ یہ ہے:

"The arts and other manifestation of human intelectual regarded collectively.

Synonyms: the arts, the humanties, intelectual activity, literature, music painting, philosophy".

"The ideas, customs and social behaviour of a particular people or society.

Synonums: Civilization, society, way of life, lifestyle, customs, tradition, heritage habits, ways, norms, values." [3]

تہذیب ان سانچوں، ضابطوں اور اصولوں کا نام ہے جو مادی ورثہ کے شانہ بشانہ نسل در نسل، قوموں، خاندانوں اور علاقوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ وہ نادیدہ عناصر ہیں جو کسی شخص اور مجموعی طور پر معاشروں اور قوموں کی نفسیات پر گہرا اثر اور نقوش مرتب کرتے ہیں۔ کسی مخصوص وقت اور علاقے کے لوگ دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ان کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ وہ شعوری اور لاشعوری پیروی کا عمل ہے جس کی چھاپ بہت گہری ہوتی ہے۔ یہ ان محرکات اور عناصر پر مشتمل ہے جو کہ کردار سازی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ تہذیب، ثقافت، رہن سہن، لین دین، لباس، اطوار، طعام و قیام، زبان و بیان اور رسم و رواج کا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان کے اندر الفاظ بھی گہرا تہذیبی اور تاریخی شعور سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

---

1. پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور
2. اسسٹنٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور
3. ویزٹنگ فیکلٹی، جی سی یونیورسٹی، لاہور
4. لیکچرار، سپیریئر کالج، مانانوالہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

لہٰذا کسی بھی ادب میں تہذیبی شعور کا موجود ہونا لازمی امر ہے دوسرا ادیب کی ذات خود زمان و مکان کی مخصوص حدود میں قید ہوتی ہے۔ جہاں معروض اُن تمام مادی اور غیر مادی بتوں، زاویوں اور محرکات پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں ادیب تخلیق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس کی لفاظی سے لے کر کرداروں کی تخلیق تک کا عمل کسی نہ کسی ماحول میں کہانی بُن رہا ہوتا ہے۔ جہاں ڈرامہ (کر کے دکھانا) کی بجائے اسے لفاظی اور تخیلاتی کرداری بت گری اور معروضی مصوری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا جس ماحول اور گرد و پیش میں کردار کہانی کے اختتام کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی تہذیب کا حصہ ہوتا ہے یا وہ کسی تہذیب کا تخیلاتی پرتویا اظہار ہوتا ہے۔

اردو میں تہذیبی ناول کی شاخیں ایک ہی تہذیب سے پھوٹی ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے ارد گرد کے ماحول سے قطع تعلق کر کے نہیں رہ سکتا۔ شاعر ہو یا ادیب، چونکہ معاشرے کے حساس ترین فرد ہوتے ہیں اس لیے اپنی تحریروں میں وہ اپنے دور اور تہذیب کی عکاسی واضح طور پر کرتے ہیں۔ نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک سب لوگ ایک ہی تہذیب اور ایک ہی قسم کے حالات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں معاشرتی حقیقتوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان سب کا مقصد معاشرتی اصلاح تھا۔ اس مقصد کے لیے تہذیبی ناول لکھے گئے جو اردو ناول کی روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سر سید احمد خانؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ہونے والی ادبی و تعلیمی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے افادی ادب کی داغ بیل ڈالی۔ نذیر احمد بھی ان سے متاثر ہوئے۔

تہذیبی اور سماجی ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۱۲ء) سے ہوا، اپنے ناولوں میں انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے دور، پس منظر اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کی۔ نذیر احمد اصلاح پسند تھے انہوں نے اپنے ناولوں میں انیسویں صدی کے اواخر کی مسلم سوسائٹی کی حقیقی زندگی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا اور پھر اردو ادب میں اس کی داغ بیل ڈالی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا سماجی و معاشرتی شعور ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اس کے بعد کی شکست وریخت کا زمانہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب محض دہلی اور لکھنؤ کی تسخیر ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب اور انحطاط کا فسانہ ہے۔ سیاسی نظام تو بدلا ہی تھا، اس کے ساتھ پرانی لیاقتیں، عقائد، وسائل اور ذریعے بھی بدل گئے۔

۱۸۵۷ء سماجی، سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے انسانی فطرت کے ظہور کی بجائے ایک تاریخی عمل تھا۔ انگریزوں کا سیاسی تسلط اور سماجی تبدیلیاں برصغیر کے زوال کی داستان ہے۔ وہ تمام روائتیں اور حرمتیں جو اس معاشرے کو عزیز تھیں وہ بتدریج متاثر ہوتی گئیں۔ ریل، ٹیلی گراف، ڈاکخانہ، نئے عدالتی نظام، نئی اصلاحات، نیا تعلیمی نصاب نیز جدید پولیٹیکل خیالات نے مروجہ معاشرتی اور تمدنی سطح کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ معاشرے کی شکست وریخت اور حقائق کا اثر شاعروں اور ادیبوں پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ نذیر احمد نے اپنے دور کے لکھنؤ کو کسی اور انداز سے دیکھا اور پرکھا اور سرشارؔ و شررؔ اور رسواؔ نے ان کی عکاسی اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ سرورؔ کے عہد کا لکھنؤ اپنی روایات کے مٹنے پر گریہ کناں نظر آتا ہے جب کہ سرشار (۱۸۴۶ء-۱۹۰۳ء) کے عہد کا لکھنؤ اپنی معاشرت، روایات، نئے حالات اور اپنی پوری جزئیات کے ساتھ رواں دواں ہے۔ سماجی ناول نگاروں میں رسواؔ کا نام بھی سرفہرست ہے۔ جنھوں نے "امراؤ جان ادا" (۱۸۹۹ء) لکھ کر لکھنؤ کی زندگی اور زوال آمادہ تمدن کی تصویر دکھائی ہے۔ سرشارؔ کے بعد شررؔ (۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶ء) کی کوششوں سے اردو میں تاریخی ناولوں کی بنیاد پڑی، تاریخی ناولوں کا جائزہ اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔ سماجی ناولوں اور کرداروں پر ان ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے ادیبوں نے بھی سماجی ناول لکھے مثلاً منشی سجاد حسین نے حاجی بغلول، احمق الدین، طرحداری لونڈی، میٹھی چھری کے نام سے معاشرتی ناول تحریر کیے۔ ان کا دور (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۵ء) کا ہے۔ مولانا حالی نے "مجالس النساء" لکھا، یہ عورتوں کی تہذیب کے موضوع پر لکھا گیا۔ ریاض خیر آبادی نے "صورت الخیال" کی تین جلدوں میں عظیم آباد کی معاشرتی زندگی کے نقشے پیش کیے۔

قاضی سرفراز حسین نے بھی کئی معاشرتی ناول تحریر کیے، طوائف کے موضوع پر لکھا، جو اُس معاشرے کا ناسور تھا اور اپنے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے ناولوں میں شاہد رعنا، سزائے عشق، سرابِ عشق، بہارِ عشق اور خمارِ عشق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا محمد سعید کے ناول خوابِ ہستی (۱۹۰۵ء) اور یاسمین (۱۹۱۸ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں لکھے جانے والے تہذیبی ناول ایک نئے دور میں داخل ہوئے۔ مرزا رسواؔ اور پریم چند نے سماجی ناولوں کا دامن وسیع کیا اور نئی راہیں متعین کیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۳۱ء) نے "امراؤ جان ادا" میں لکھنؤ کی انحطاط پذیر معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے افشائے راز، ذات شریف، شریف زادہ، اختری بیگم جیسے تہذیبی اور مقصدی ناول لکھے۔ اس صدی کا دوسرا اہم نام منشی پریم چند (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء) ہے، انھوں نے اپنے دور کی عصری تاریخ کو ناولوں میں قلم بند کر کے تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ پریم چند کے بعد معاشرتی کرداری ناول لکھنے والے ترقی پسند ادیبوں میں کرشن چندر (شکست)، سجاد ظہیر (لندن کی ایک رات)، عصمت چغتائی (ٹیڑھی لکیر)، عزیز احمد (گریز)، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، صالحہ عابد حسین، حجاب امتیاز علی، شمس الرحمان فاروقی وغیرہ شامل ہیں، ان کے ناولوں میں روحِ عصر کی جھلک ملتی ہے۔

اردو ناول پر تقسیم ہند کے بھی بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں جب ملک کی تاریخ سنہرے حرفوں میں لکھی جا رہی تھی۔ یکایک فرقہ واریت کے سیلاب نے صدیوں کی بنی ہوئی مشترکہ تہذیب و تمدن کو پل بھر میں پاش پاش کر دیا۔ وطنِ عزیز نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے منقسم ہوا بلکہ ایک دل، ایک جان، ایک زبان، ایک کلچر، ایک تہذیب اور ایک تاریخ کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ یہ سانحہ ہندوستانی تاریخ کا ہی جاں سوز پہلو نہیں بلکہ ایک دردناک المیہ بھی ہے۔

ملک کی تقسیم نے انسانی و اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات بڑے پیمانے پر ہوئے اور پھر ایک نئے ملک کا وجود عمل میں آیا۔ جب آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تو اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، کیونکہ تقسیم ہند کے بعد بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ، شاعر، ادیب، تاجر، دست کار، صنعت کار پاکستان کوچ کر گئے اور یہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے اردو داں طبقے کا بھی یہی حال تھا۔ ایسے حالات میں اردو ادب میں فسادات اور ہجرت سے متعلق مسائل کا ذکر آنا اردو ناول میں لازم تھا۔ ان ناولوں کا ذکر اگلے چند صفحات میں آئے گا، جہاں ان کی معاشرت اور کردار نگاری کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ معاشرتی ناولوں میں فسادات اور ہجرت کے علاوہ اردو ناول مین جن واقعات کو سب سے زیادہ موضوع بنایا گیا اور بنایا جاتا ہے وہ ہیں جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ، شہری زندگی کے تضادات، گاؤں کی زندگی کے مسائل، خواتین کے مسائل، فیملی مسائل وغیرہ۔ ان مسائل نے ہندوستانی اور بالخصوص مسلمانوں کی جذباتی اور اقتصادی زندگی پر کاری ضرب لگائی۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قاضی عبد الستار، جمیلہ ہاشمی، عزیز احمد، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور اور بانو قدسیہ وغیرہ نے ان معاشرتی موضوعات پر آواز اٹھائی اور خاطر خواہ تدابیر بھی پیش کیں۔

اردو ناولوں میں تہذیبی کرداروں کے خدوخال کو اجاگر کرنے کی بہت عہد ساز اور یادگار مثالیں ملتی ہیں۔ ناول نگاروں نے جس سلیقے سے کرداروں کے انتخاب میں محنت کی ہے اور ان کی تعمیر و تشکیل میں جس ہنرمندی اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر تحقیقی و تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور ایسے ناول نگاروں کو اردو ادب میں بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان تمام ناولوں کو زیرِ بحث لانا تو ممکن نہیں ہے لیکن چند نمایاں ناولوں کا تنقیدی اور تحقیقی تجزیہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

پیش کیا جاسکتا ہے تا کہ تہذیبی ناول نگاری کی اس عظیم تاریخ کی عکاسی ہو سکے۔ تہذیبی ناولوں میں جس ناول کو تاریخی اعتبار سے اردو ادب میں بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے وہ رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" ہے۔ جسے ناول کے کلاسیکی عہد میں اولیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

فسانۂ آزاد (۱۸۸۰ء):

فسانۂ آزاد سرشار کا ضخیم ناول ہے جو ۱۸۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کی چار جلدیں سوا تین ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ جس دور میں یہ ناول تخلیق ہو رہا تھا اس وقت ہندوستان اور بالخصوص لکھنو قدیم اور جدید تہذیب کی کشمکش اور تصادم میں گرفتار تھا۔ نیا سماج انگڑائیاں لے رہا تھا۔ روایتی مزاج کے لوگ اپنی شان و شوکت کی بقا کر رہے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ نئی تہذیب اور روشن اقدار کے استقبال میں مصروف نظر آتا ہے۔ ایسے تذبذب کے ماحول میں سرشار نے آنکھیں کھولیں۔ سرشار نے سارے واقعات کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فسانۂ آزاد میں لکھنو کی تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی تہذیب پوری طرح نظر آتی ہے۔

فسانۂ آزاد ایک زوال آمادہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں زوال سے دوچار لکھنو کی معاشرتی زندگی اور تاریخ کے ظالم دھارے کا ذکر بڑی بے باکی سے ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ:

> "سرشار انقلاب لکھنو کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں تاریخی واقعات، سیاسی انقلاب کا ذکر بین السطور میں آیا ہے۔ لاشعوری طور پر انھوں نے اپنے عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی بدحالی کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اڑھائی ہزار صفحات میں آج سے سو سال پہلے کی تاریخ کے نقوش جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔" ۵

سرشار کے عہد میں ایک تاریخی عہد دم توڑ رہا تھا، دوسرا عہد اس کی کوکھ سے جنم لے رہا تھا۔ لکھنو کے مست حال اور سہل پسند عوام نے اس انقلاب سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے لکھنو کو جس طرح سرشار نے فسانۂ آزاد میں پیش کیا ہے، کوئی اور بیان نہیں کر سکتا۔ سرشار نے اس ناول سے صرف تخلیق ہی کا کام نہیں لیا بلکہ اس قصے سے سماج کی اصلاح، اپنے دور کی تاریخ اور تنقید حیات کا کام بھی لیا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی فسانۂ آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "سرشار اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اردو ناول کو اس کے بالکل ابتدائی دور میں ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا پیش خیمہ کہنا چاہیے۔ "فسانۂ آزاد" (۱۸۸۰ء) سرشار کا شاہکار اور پورے اردو ادب کا اہم کرداری ناول ہے ... اگر ادب کے معنی ہیں زندگی کی حقیقی ترجمانی تو پھر ہمیں فسانۂ آزاد پڑھنا چاہیے۔" ۶

سرشار نے اس ناول میں ایک تہذیب کی عکاسی کی ہے، ایک ایسی البم پیش کی ہے جہاں ہر کردار متحرک ہے، ساکن کچھ بھی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سارے کردار ایک دوسرے سے باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ سرشار کے کردار زندگی سے وابستہ ہیں اور زندگی سے بھرپور ہیں، ایک ہجوم ہے جو امنڈتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک مسلسل ہنگامہ ہے، جو بپا ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ سرشار کی دنیا میں سب کچھ ہے سوائے وہم و گمان کے، اس کے کرداروں میں زندہ رہنے کی باتیں ہیں۔ بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی:

> "فسانۂ آزاد کے پردے میں ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے فوراً بعد کے لکھنو کے نوابی درباروں کا نقشہ اس کمال سے پیش کیا ہے کہ واقعات، ماحول اور کردار ہمارے سامنے زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔" ۷

ناول میں اس عہد اور سماج کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سرشار نے اپنے کرداروں کو زبان دے دی ہے جو بولتے اور باتیں کرتے ہیں۔ وہ ناول میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقے کے افراد کو شامل کرتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو میاں آزاد ہیں جن کا نصب العین لطف و انبساط کا حصول ہے۔ وہ نہایت کھلنڈرا اور اوباش قسم کا انسان ہے۔ اس کا ایک ساتھی میاں خوجی ہے، جس کا مشغلہ لکھنو میں آوارہ گردی کرنا ہے۔ آزاد کا کوئی شجرۂ نسب نہیں۔ اُس دور کی ظاہر داری، شرافت اور شریفانہ اقدار کی پاسداری آزاد کے بس کا روگ نہیں۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں زندگی اور معاشرے کو سیکولر یعنی غیر مذہبی انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر عارف:

> "سرشار کے سیکولر رویے کے باعث فسانۂ آزاد کی محفل آزاد خیالی کے نو بہ نو رنگوں سے سجی ہے۔ سرشار، جاگیر دارانہ تہذیب و تعلیم سے سخت بیزار تھے اور تہذیبِ مغرب کے دلدادہ۔ فسانۂ آزاد کا ہیرو آزاد مصنف کے منشا و مافی الضمیر کا علمبردار ہے۔ "روایتی مکتب تعلیم دیکھ کر اسے وحشت ہوتی ہے اور مولوی صاحب کا طرزِ تعلیم آزاد کو غرفش لگتا ہے۔" مغرب کی جدت اور تہذیب کی جھلک دیکھتے ہی آزاد کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔" ۸

آزاد مغربی طرز کے شہر میں گم ہے۔ ان کے نزدیک مغرب میں علم کی گرم بازاری ہے اور مشرق میں عاقبت نااندیشی یعنی کتاب سے عدم دلچسپی ہے۔ یہ تبدیلی اور مشرق و مغرب کا تضاد اُس دور کے لکھنو بلکہ پورے ہندوستان کے لوگوں میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سرشار نے خوجی و آزاد کے جو متضاد کردار پیش کیے ہیں، ان کی مدد سے وہ ایک طرف تو لکھنو کی پرانی تہذیب کو ہدف طنز بناتے ہیں اور دوسری طرف نئے سماجی شعور کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ جو بڑے بے ڈھنگے طریقے سے سماج میں نمودار ہو رہا تھا۔

فسانۂ آزاد کے ہیرو ہیروئن، آزاد اور حسن آرا مثالی کردار ہیں۔ حسن و جمال اور دیگر اوصاف حمیدہ میں بے مثال ہیں۔ تاہم ان کو ممتاز کرنے والی صفات، فکر و عمل میں آزاد خیالی اور آزاد خیالی سے ہم آہنگ ماحول ہے۔ ان میں روایتی اقدار ہیں۔ آزاد زیادہ تر درباریوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ درباروں میں جا کر مصاحبی بھی کرتا ہے۔ لکھنو کے بازاروں کی سیر کرتا ہے، میلے ٹھیلے دیکھنا اس کا پسندیدہ شوق ہے۔ ایک دن میاں آزاد کی نظر لکھنو کے اعلیٰ خاندان کی ایک دوشیزہ حسن آرا پر پڑتی ہے۔ آزاد اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ حسن آرا سے شادی کا اظہار کرتا ہے۔

حسن آرا بڑی خوددار اور تعلیم یافتہ دوشیزہ ہے۔ گویا، حسن آرا محض شخص یا جاگیر دار ہی نہیں بلکہ جدید مغرب کے مفہوم میں "فرد" (Individual) ہے۔ جو آزاد فضا میں اپنے فطری امکانات بروئے کار لاتا ہے۔ حسن اتفاق سے اس کے حصے میں جو سماج آیا ہے وہ بھی روشن خیال ہے۔ اس کے دل میں مسلمانوں کے لیے ہمدردی ہے اور دماغ نئی روشنی سے منور ہے۔ حسن آرا میاں آزاد کا امتحان لیتی ہے۔ وہ ترکی میں روسیوں کے خلاف جنگ میں شرکت کی تجویز پیش کرتی ہے۔ بہادری سے لڑتے ہوئے کامیابی نصیب ہوئی تو میں تمھاری بیوی اور اگر موت آگئی تو شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔ آزاد حسن آرا کی گفتگو سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی میاں خوجی کو لے کر ترکی چلا جاتا ہے۔

حسن آرا سے شادی کرنے کے لیے وہ داستانوی عاشقوں کی طرز پر جنگ میں شریک ہونے کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اس سفر میں وہ بے شمار اور نت نئی وادیوں سے گزرتا ہے۔ آزاد نے متعدد مقامات پر عشق کیا، جو اس کی فطرت تھی۔ جنگ میں کامیاب ہو کر میاں آزاد واپس آتا ہے۔ حسن آرا اور میاں آزاد کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں کردار میاں بیوی کے روپ میں سماجی اور اصلاحی کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس قصے کو طویل سے طویل کرتے ہوئے سرشار نے ۴ جلدیں بنا دیں، جس سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا اور یہ کرداری ناول نگاری میں صفِ اول کا ناول کہلایا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، سرشار کے ناول میں کردار نگاری، سماجی بصیرت اور بدلتی ہوئی دنیا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ”سرشار اپنی تہذیب کے ایک ایک کردار سے آگاہ تھے اور فسانۂ آزاد ان تمام کرداروں کو ایک رواں منظر میں پیش کر کے ان کی طبقاتی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ سرشار اس سماج کے مختلف طبقات، ان کے کردار اور ان کی زبان سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان طبقات کی زبان کا لسانی ادراک اور کرداروں کی سوجھ بوجھ سرشار کے فن میں نہایت اہم ہے۔“ ۹

سرشار نے لکھنو کی تہذیب و تمدن کے ہر رنگ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لکھنو کے مٹتے ہوئے تمدن کی مصوری بڑی فنکاری سے کی ہے۔ ان کے ناول میں حسن و عشق کے قصے ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نظر آتے ہیں۔ سرشار کو بالخصوص بیگماتی زبان، معاشرت اور رواسم پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اسی طرح وہ مردوں میں بھی ہر طبقے، ہر قوم، ہر پیشے اور حرفے کے آدمی سے کماحقہ واقف ہیں۔ دھوبی، چمار، کنجڑے، لچے، نواب، سنار، ساہوکار، نجومی، پنڈت، جیوتشی، طبیب، ڈاکٹر، ملا، عالم، مجتہد، افیونیوں اور غنڈوں تک کو پوری طرح جانتے ہیں۔ یہ سب کی زبان و سیرت کے ایسے ایسے پہلو دکھاتے ہیں جہاں عام انسان کی نگاہ نہیں جا سکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مٹتے جاگیر دارانہ نظام میں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

سرشار کے لکھنو میں نواب، امراء اور رئیسوں نے الگ ہی دنیا قائم کر رکھی ہے۔ لکھنو کے نوابی محلوں کی عکاسی اس خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ اس زمانے کی پوری سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ وہ ماحول کی خوبی اور خرابی ایسے بیان کرتے ہیں کہ ہم باقاعدہ اس کی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سرشار نے ”فسانۂ آزاد“ میں زندگی کے اچھے، برے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ ان کا ناول زندگی کی تنقید اور ترجمانی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست فسانۂ آزاد میں لکھنو کی سماجی زندگی کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> ”سرشار نے لکھنو کے معاشرے اور زندگی کو ناول میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس معاشرے کی یہ ایسی مکمل اور جامع تصویر ہے کہ اس میں محلوں سے لے کر بازاروں تک زاہدان خشک سے رنگین مزاجوں تک۔ بیگمات سے لے کر مہریوں تک۔ حرم سراؤں سے لے کر کوٹھوں تک۔ معشوقانِ عشق پیشہ کی عیاریوں سے لے کر حسین پردہ فیشن کی سادہ کاریوں تک ہر مقام اور ہر شخص کا حال سچا بھی ہے اور دلآویز بھی۔“ ۱۰

بلاشبہ فسانۂ آزاد میں سرشار کی منظر نگاری اور کردار نگاری درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے۔ انھیں چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کی عکاسی کرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ فسانۂ آزاد میں جو رنگینی، عیاشی، عریانی، ظرافت یا تفریحی عناصر نظر آتے ہیں، انھی کی بدولت لکھنو کی زندگی کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ یہ چیزیں لکھنو کی زندگی کی عکاس ہیں۔ ان چیزوں کو لکھنو والے سیاسی و سماجی، تہذیبی انتشار اور تباہی کے بعد بھی ترک نہ کر سکے۔ لکھنوی تہذیب کی ایک جھلک یوں دیکھیے:

> ”اللہ اللہ جہاں تک پیک نظر کی رسائی ہے۔ بگھیوں، اکوں اور گھوڑوں اور ہاتھیوں اور رتھ اور بہلی اور ڈولیوں اور فٹنوں کا ہجوم، جدھر جاؤ دھوم، جدھر جاؤ ہجوم، بانکے ترچھے، تیکھے، ٹودے گنڈے، لقے، لقندرے، دوانگل کی نکے دار ٹوپیاں، البین سے مستک گاہ پر جمائے، انکھڑیوں میں سرمہ لگائے، ہانڈے ٹیکتے، آنکھیں سینکتے، براتے، اینڈتے، تنتے، اینٹھتے، شربتی کی تین کمر توئی اونچی چولی کے انگرکھے پھڑکاتے، پرے جمائے چلے جا رہے ہیں، جو ہے او بچی بناڈنڈ پیل چوبل کرتا ہے۔“ ۱۱

لکھنو کی تہذیب گو ایک عظیم تہذیب تھی جس نے علوم و فنون کو بڑی قد آور شخصیات دیں مگر ہر تہذیب اپنے عروج کے بعد زوال کی سمت قدم اٹھاتی ہے۔ لکھنو کی تہذیب جب بحران کا شکار ہوئی تو اقدار اور معاشرتی معیارات، تہذیب اور سماج بے عملی کا شکار ہو گئے۔ حقائق پسندی کی جگہ تصنع اور بناوٹ اور عمل کی جگہ مسکرات نے لے لی۔ چونکہ اس وقت لکھنو کی تہذیبی زندگی اعلیٰ مقاصد کی بجائے عیش پرستی، مزاح، پھبتی، پھکڑپن اور بے فکری کا محور نظر آتی ہے۔ سرشار کے کردار بھی زندگی کے متعلق اسی قسم کے رویے کا شکار ہیں۔ اُن کے کردار زندگی کی اٹل حقیقتوں سے قطع نظر میلوں، ٹھیلوں اور تقریبات میں نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک بے تکلفی ہے، ایک بے باکی ہے۔ یہ کردار لکھنو کے حقیقی کردار ہیں۔ سرشار نے ان کرداروں کی تعمیر میں کسی قسم کی مثالیت کو داخل نہیں ہونے دیا۔

ناول میں جس طرح دیگر لوازمات اہم ہوتے ہیں، کردار نگاری بھی وہیں مسلمہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ کسی معاشرت کی صحیح عکاسی اور مکمل تصویر پیش کرنے کے لیے کرداروں کا اپنی پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ فسانۂ آزاد میں کرداروں کی بھرمار ہے، ہر صفحہ پر ایک آدھ نیا کردار نمودار ہوتا ہے خواہ اس کی آمد اور غائب ہونے کے درمیان بہت مختصر عرصہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود فسانۂ آزاد کے کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں آزاد ایک مثالی کردار جبکہ مضحک کردار میں خوجی سب سے اہم ہے۔ فسانۂ آزاد کا ہیرو آزاد ہے۔ آزاد لکھنوی معاشرت کا خوبصورت مرقع ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو لکھنو کے بگڑے ہوئے روسا اور نوابین کا خاصا تھیں۔ سرشار نے اپنے ہیرو کو ہمہ صفت اور ہمہ جہت بنانے کے لیے اس میں جو اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس سے آزاد کا کردار بڑی حد تک مثالی بن جاتا ہے۔

خوجی اپنی بعض خصوصیات کی بنیاد پر اردو نثر کے مضحک کرداروں میں ایک خاص اہمیت اور اولیت کا حامل ہے۔ خوجی دراصل لکھنو کی تہذیب کے ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو تبدیلی کی لہر میں بے بس ہے۔ خوجی ماضی کی بے جان روایات کا امین ہے۔ اس کا ہر عمل لاشعوری ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ اس کے ادراک، زندگی میں کوئی ارتقا نہیں لا سکتے۔ وہ معاشرے کے جمود سے جڑا ہوا جامد کردار ہے۔ حقیقت پسندی کی رو سے وہی حقیقی ہے جب کہ آزاد، آنے والے خوش آئند دور کی نوید ہے، وہ آزاد فرد ہے۔ وہ ماضی اور حال کی روایات سے یکسر مبرا بھی نہیں۔ لہٰذا فکری و عملی اعتبار سے اس کے کردار میں تضادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

میاں آزاد حسن آرا سے سچا عشق کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سچے عشق کا مطلب یہ ہر گز نہیں تھا کہ سپہرا آرا، اللہ رکھی، زینت النسا اور اختر النسا کو مایوس کرتے ہیں۔ بمبئی میں بیگم مرزا، اللہ رکھی اور زینت النسا ہیں جب کہ یورپ میں مٹیڈا، کلیریسا اور پولینڈ کی شہزادی جیسی عشق باز خواتین کے آزاد سمیت اور بھی کئی عاشق ناول میں دکھائے گئے ہیں۔ یوں انسانوں کے جنگل میں آزاد اور خوجی ہی دیو پیکر اور بونے نہیں بلکہ متعدد دیو پیکر اور بونے کردا رہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام فسانۂ آزاد کی کردار نگاری کے بارے میں یوں مبالغہ کرتے ہیں:

"... ان کی تصویر میں، نوابین اپنے ندیموں اور مصاحبوں کے ساتھ ہیروں کی طرح جگمگاتے ہوئے، رنڈیاں، بوڑھے فیل بانوں سے آنکھیں لڑاتی ہوئی، فقیر پیچھے پیچھے دوڑتے اور دعائیں دیتے ہوئے، نئی وضع کے مسلمان ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے اور بنگالی بابو مہین دھوتیاں ہوا میں اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں ... البتہ سرشار کے پاس دو آئینے ہیں ... ایک کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کردار دیو قامت نظر آتے ہیں اور دوسرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر شخص بونا دکھائی دیتا ہے جس سے ... فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردار بڑے سے بڑے ہجوم میں بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔"[۱۲]

دیو قامت کردار آزاد اور بونا، خوجی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ دونوں کی کردار نگاری میں سرشار نے مثبت اور منفی مبالغہ کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہجوم میں بھی ان کی پہچان ہو پائے۔ غرض یہ کہ، آزاد ایک خوبصورت لڑی ہے۔ جس میں رفتہ رفتہ نت نئے موتی پروئے جاتے رہے۔ گویا، منشائے مصنف بھی یہ ہے کہ انسانوں کے مابین، پیار، محبت اور احترام کا جذبہ لازم ہے۔ سرشار نے سماج کے نچلے طبقے کے افراد کی نفسیاتی گرہ (Psycho-complex) کشائی کی ہے اور ان کے تعلق سے اس زوال پذیر عہد اور معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ دراصل اردو میں حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کے رجحان کے پیشِ نظر چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک زوال پذیر معاشرت کا نقشہ کھینچ رہے تھے اور یہ سچ ہے کہ زوال پذیر معاشرے میں کس طرح کا معیار بلند ہوتا؟

گزشتہ صفحات میں جو تجزیہ کیا گیا اُس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ "فسانۂ آزاد" معاشرے کی "سماجی زبوں حالی" پر بنیادی ناول ہے۔ جس میں آزاد اور خوجی اپنا رنگ دکھا جاتے ہیں۔ سرشار نے اپنے ہیرو آزاد کے کردار کو بڑی حد تک مثالی بیان کیا ہے۔ اس کردار کا ارتقا اس طور نہیں ہوا جس طرح ناول کے مرکزی کردار کو ہونا چاہیے۔ مثلاً آزاد سارے ناول میں خوجی کا مضحکہ اڑاتا ہے اور اس کی تفریح طبع کے لیے اُسے ساتھ رکھتا ہے مگر کسی مرحلہ پر بھی وہ خوجی کی مظلومیت سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ آزاد کے کردار کا "غیر انسانی پہلو" ہے یہ کسی مکمل کردار میں موجود نہیں سکتا۔

اس ناول کا سب سے زیادہ جان دار اور متحرک کردار خوجی اپنی مخصوص حرکات و سکنات سمیت قارئین کے ضیافت طبع کا سامان بنتا ہے۔ یہ کردار ناول میں دلچسپی پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے اور سرشار نے اس کی موجودگی سے کہیں بھی قصے کے ارتقا میں کوئی مدد نہیں لی۔ یہ غالباً اس وجہ سے بھی ہے کہ خوجی کے کردار کا ارتقا پیش نہیں کیا گیا بلکہ وہ ہمارے سامنے ایک ترشے ترشائے اور ڈھلے ڈھلائے کردار کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ کردار جامد نہیں ہے، ناول میں جب دیکھو چلتا پھرتا، بولتا چالتا بلکہ کودتا پھاندتا نظر آتا ہے۔

سرشار فطری طور پر مزاح نگار تھے۔ انھوں نے مضحک چیزوں کے بے مثال نقشے کھینچے ہیں۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنو کے نوابوں کی زندگی کا خاکہ خوب اڑایا ہے۔ فسانۂ آزاد کی بنیاد ہی سرشار نے مشاہدے اور تجربے پر رکھی ہے۔ انھوں نے اپنے معاشرے میں جو کچھ دیکھا وہ سب کچھ لکھ دیا۔ سرشار کے اکثر کردار عشق کے کارِ دلچسپ میں مشغول نظر آتے ہیں۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں عشق کو ٹھیٹ لکھنوی تہذیب کے پس منظر میں ملا کر حقیقت کے قریب کر دیا ہے۔ سرشار نے ناول میں وہی کچھ لکھا جو انھوں نے اپنے گرد و پیش میں دیکھا تھا۔ لکھنو کے زوال پذیر معاشرے اور سرشار کی حقیقت نگاری کو ایک مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

"وہ (سرشار) لکھنو کی اس زوال پذیر سوسائٹی کا نقشہ کھینچ رہے تھے جس کا معیار گر چکا تھا۔ جہاں عورت بکاؤ مال تھی اور بہت ہی ارزاں اور سستی، ہر گھر میں نہریاں ہیں جن کی جوانی پیسے والوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہے۔ چوڑی والیاں، دلال اور دلالنیں ہیں جو تاریک گلیوں اور اندھیری راتوں میں عورتوں کا سودا کرتی ہیں۔ لکھنو کا چوک ہے جو تہذیبی ادارے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ یہاں وضع و شرافت کے نمونے ہیں۔ یہاں حسن رقصاں ہے اور شباب اس پر نچھاور ہو رہا ہے، یہاں پر افیم کی چسکی اگر کوئی لے رہا ہے تو شراب کے خم کے خم بھی چڑھائے جا رہے ہیں۔ یہاں پر کچھ پھول باسی ہیں تو سینکڑوں کچی کلیاں بھی ہیں۔ یہاں پر بردہ فروشی عام ہے۔ ہر طوائف دو چار نوچیاں رکھنے کا اہتمام کرتی ہے... یہاں پر امراء اپنا کام بلند کرنے کے لیے آتے تھے۔ یہاں پر بیٹے ہی نہیں، ابا میاں بھی آتے ہیں... لکھنو کے آس پاس دیہاتوں میں سینکڑوں فیروزہ قائم ہیں جن کی ہر ادا پر بن پرستا ہے۔ سرشار نے ان محفلوں میں خود بھی بارہا شرکت کی تھی اس لیے اس کے ہو بہو نقشے کھینچے ہیں۔ یہ عریانی نہیں بلکہ فن کا ایک حصہ ہے، حقیقت نگاری ہے اور ایک تہذیب کی بھرپور عکاسی۔"[۱۳]

سرشار ہر روز لکھنوی معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کو دیکھتے تھے اور ناول میں اس کی تصویر کشی کرتے تھے۔ لکھنوی معاشرت اور تہذیب کے یہ سارے مرقعے اسی رند آزاد مشروب کے مشاہدے کا عکس ہیں۔ فسانۂ آزاد میں ایک اور تاریخی و حقیقی باب قلم بند کیا گیا ہے۔ فسانۂ آزاد کے ہیرو آزاد کا خلافت عثمانیہ کی بقا اور آزادی کی خاطر، ترکی میں جانا محض سرشار کی داستان سرائی نہیں، بلکہ تاریخ عالم کا ایک باب ہے۔ ۱۸۷۷ء کی روس و روم جنگ بھی، فسانۂ آزاد کا ایک اہم موضوع بنی، جس کے ناول میں جا بجا حوالے ملتے ہیں۔ آزاد اس جہاد کی خاطر چل پڑتا ہے اور جہاز پر سوار ہونے سے پہلے وہ حسن آرا کو خط میں لکھتا ہے:

"... میں کچھ اس وجہ سے تو روم جاتا نہیں ہوں کہ بہشت میں جگہ ملے... میں تو اس لیے جاتا ہوں... اپنے پیارے بھائی مسلمانوں کا ہاتھ بٹاؤں... اس کوشش میں چاہے آزاد مر ہی کیوں نہ جائے مگر روم پر آنچ نہ آنے پائے۔"[۱۴]

"روس و روم جنگ بچوں کا کھیل نہیں تھی۔ نوے ہزار (۹۰,۰۰۰) روسی لشکر خفیہ انداز میں دریائے ڈینوب پار کر کے، ترکی کے علاقے پر قابض ہو چکا تھا۔ وزیر جنگ کا حکم تھا کہ ہر ایک ترک غاصبوں کے خون کا پیاسا ہو۔"[۱۵]

یاد رہے کہ فسانۂ آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک اودھ اخبار میں بالا قساط شائع ہوتا رہا۔ یوں ایک اہم مرحلۂ تاریخ میں سماج، تہذیب، معاشرت، سیاست اور تاریخ سمیت یہ ناول اہل ہند کے جذبات و خیالات کا ترجمان بھی تھا۔ خصوصیات کی بنا پر فسانۂ آزاد میں لکھنو کی تاریخ، زوال پذیر معاشرت، عمدہ کردار نگاری اور مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

چناں چہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''فسانۂ آزاد'' اردو ناول کی تاریخ میں اس لیے زندہ رہے گا کہ ایک خاص عہد کا لکھنو اس کی بدولت زندہ ہے اور اس لیے زندہ ہے کہ ناول نگار نے اس کا پوری طرح مشاہدہ کیا ہے۔ اس کی ہر چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالا ہے، اس کی مجلسوں میں پوری بے تکلفی سے شریک ہو کر اس کے مزاج کی نزاکتوں میں دخل حاصل کیا ہے اور یوں پوری طرح اس کا ہم دم و ہم راز بن کر اس کے بھید کھولے ہیں۔ لکھنوی معاشرے کے جسم و جان میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی مصنف نے اس کی نسوں میں چھپ کر دیکھی اور اس کے دل کی دھڑکنیں سینے میں سما کر سنی ہیں۔ لکھنوی معاشرت کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس معاشرے کے کرداروں کی سیرت کشی میں بھی سرشار نے کمال ژرف نگاری کا ثبوت دیا ہے۔

سرشار نے اپنے کرداروں کے ذریعے ہمیں صرف ہنسایا ہی نہیں بلکہ ان کے مزاح کی آڑ میں بعض دوسرے پہلوؤں کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کرداروں کی بے فکری، مزاحیہ حرکات، اُس وقت کے کھوکھلے سماج کی غمازی کرتی ہیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

> ''سرشار کا کمال یہ ہے کہ ان کرداروں کے ذریعے انھوں نے روایت اور تفسیر، جدید برتی ہوئی اخلاقی قدروں، تعلیمی مسائل اور رہن سہن کے طریقوں کے راز فاش کیے ہیں ... سچ یہ ہے کہ جو خصوصیت فسانۂ آزاد کو حاصل ہوئی اور کئی ہزار صفحات کی کتاب ہونے پر بھی اشتیاق سے پڑھی گئی۔ ویسے شاذ ہی کوئی کتاب پڑھی گئی ہو۔'' ۱۶

بے شک! فسانۂ آزاد سرشار کا ایک شاہکار ہے۔ یہ ایک شہر، ایک سماج کی بہت سی پرتوں کو ہمارے سامنے التا ہے۔ سرشار کے یہاں پورا لکھنو موجود ہے۔ یہاں ہر قوم اور ہر طبقے کے لوگ ہیں۔

اسی لکھنو میں بہت سے صاحب کمال پیدا ہوئے، سیاسی، سماجی اور تمدنی انقلاب آئے، ادب کی تخلیق ہوئی اور یہ اردو ادب میں ایک علیحدہ دبستان گیا۔ یہاں عورت زندگی ہر شعبے پر حاوی رہی، لکھنو کا چوک، لکھنو کی حیات کے لیے شہ رگ تھا۔ یہاں نوابی رہی، درباری رہی، افلاس اور غربت کے ساتھ جرائم اور گھناؤنا پن رہا۔ غدر کے بعد لکھنو کی زندگی کا اتار چڑھاؤ طوفان میں اٹھتی ہوئی موجوں کی طرح واضح تھا، جس کی عکاسی فسانۂ آزاد میں بھرپور طریقے سے کی گئی ہے۔ سرشار کے ناول میں لکھنو کی خالص زبان ہے۔ لکھنو کی سماجی زندگی کے بھرپور نقشے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وہ خود لکھنو ہیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا اور لکھنو کے سماجی، تاریخی، تمدنی اور تہذیبی احساسات کا بیان ''فسانۂ آزاد'' ہے۔ سر عبدالقادر کے الفاظ میں:

> ''میں نے خود لکھنو کی حقیقی زندگی کا سرشار کے مرقعوں کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھا ہے اور بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ فسانۂ آزاد انسان کے جذباتی اور ذہنی نظام کا علمبردار ہے... لکھنو کا کوئی باشندہ خواہ وہ کاہل و آرام و پسند، وثیقہ وار ہو یا معمولی بدمعاش، خواہ وہ ڈینگ مارنے والا شہ باز ہو یا خیالی پلاؤ پکانے والا افیونی، ہر ایک کا نمائندہ اور مرقع سرشار کے ہاں ''فسانۂ آزاد'' میں مل جائے گا۔'' ۱۷

سرشار کے ہاں لکھنو پوری جزئیات کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ایک مخصوص موضوع عہد، سماج اور تاریخ کا انتخاب، ان سے پوری طرح واقفیت، گہری نظر سے ہر پہلو کا مشاہدہ اور پورے انہماک کے ساتھ اس کی ایسی مصوری کرنا کہ ہر خط و خال نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔ فسانۂ آزاد میں پیش کی گئی معاشرت، عمدہ کردار نگاری، تاریخی حقائق اور ایک خاص عہد کا بے لاگ بیان، اردو ناول نگاری کی روایت کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔ جسے اردو کرداری ناول نگاری کی روایت میں ہمیشہ اہم اور مقدم سمجھا جائے گا۔

امراؤ جان ادا (۱۸۹۹ء)

ناول امراؤ جان ادا، مرزا محمد ہادی رسوا نے ۱۸۹۹ء میں پیش کیا تھا، جب غدر میں برطانوی سامراج کے خلاف مہم اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ اس ناول میں رسوا نے طوائف کو وسیلہ بنا کر نہ صرف لکھنو کی تہذیب و معاشرت کی تصویر کھینچنے کی کوشش بلکہ سماج کی ناگفتہ بہ حالت، اس کے جبری رویوں اور مسلم زوال کے مختلف زاویوں کو کہانی کے مرکزی دائرے میں نمایاں کیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر حقیقت نگاری، نفسیاتی دروں بینی، تہذیبِ نفس، اصلاحی مقاصد، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل اور فنی غیر جانبداری کا ایسا معیاری نمونہ پیش کیا کہ اُن کی اس مختصر تصنیف کو اردو کے ایک مکمل سماجی اور کرداری ناول کا رتبہ حاصل ہوا۔

امراؤ جان ادا گو ایک طوائف کی زندگی کی روداد ہے مگر خانم کے نگار خانے میں طوائفوں اور نوابوں، شریف زادوں، مولویوں، پرہیز گاروں، بدمعاش ڈاکوؤں، سادہ لوح نوجوانوں اور جہاندیدہ بزرگوں کی نفسیات کو بھی دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''امراؤ جان ادا کہنے کو تو لکھنو کی ایک طوائف کا قصہ ہے مگر یہ کتاب ناول کے لحاظ سے بہت کامیاب، جامع اور دلچسپ ہے۔ اس میں طرزِ معاشرت اور جذباتِ انسانی کی بے مثل نقشہ کاری کی گئی ہے، کردار نگاری پورے عروج پر ہے... اس میں غدر سے کچھ پہلے کی لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب، وہاں کی پر تکلف زندگی، معاشرتی قدریں، سیر تماشے، غدر کے ہنگامے، مختلف طریقوں پر انقلابِ عظیم کے اثرات نے سب کچھ بیان کر دیا ہے۔'' ۱۸

مجتبیٰ حسین کے اس بیان سے نہ صرف ناول ''امراؤ جان ادا'' کے بارے میں ایک مکمل اور جامع تعریف سامنے آتی ہے۔ بلکہ خود ناول نگاری کی فنی خصوصیات بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ یعنی بہترین ناول کے لیے یہ لازم ہے کہ اس کے قصے کی بنیاد معاشرتی اقدار پر ہو، اس میں جذبات انسانی کی عکاسی ہو، واقعات میں ربط و تسلسل ہو، کردار نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی جائے تاکہ جس معاشرتی کہانی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، وہ پوری خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہو سکے۔ مرزا خود کہتے ہیں کہ:

> ''ناول ایک ایسی عمدہ چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم وہی نقشے جو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، دوسروں کو دکھا سکتے ہیں۔'' ۱۹

مرزا ہادی رسوا کی یہی بات ان کی معاشرتی ناول نگاری اور حقیقت نگاری کی منشور ہے۔ ان کے ہاں توازن اور تناسب ملتا ہے، رسوا نے طوائف کے آئینہ خانے میں سماجی اور ثقافتی نقش بہت گہرے سجائے ہیں۔ امراؤ جان ادا، اردو ناول نگاری کی روایت کا سنگ میل ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی اس ناول کے بارے میں رقم طراز ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"امراؤ جان ادا" ایک ایسی ادبی تخلیق ہے جس میں ناول کے روپ میں ایک خاص عہد کی تہذیب، معاشرت، مذہبی سوچ، منفی رویئے، دشمنیاں، دوستیاں، عورت کی مجبوری اور اس پر رائج ظلم کی کہانی اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا غلط کو غلط سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔ ناول "امراؤ جان ادا" اردو ادب کا ایک کلاسیکل ناول ہے۔ جس میں ایک خاص عہد کی تہذیب کو اس کے تمام رنگوں اور روایات کے ساتھ جیتی جاگتی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔" ۲۰

"امراؤ جان ادا" طوائفوں کی مخصوص زندگی کا عکس بھی ہے اور اس میں اس مخصوص طبقے کے ذہنی میلانات بھی ہیں اور طبقہ امرا کے ہاں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط کا ذکر بھی ہے۔ امراؤ جان ادا میں لکھنو کی معاشرت میں طوائف کی جو سماجی اہمیت اور حیثیت متعین ہو گئی تھی اُس کا پس منظر بھی موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مرزا رسوا نے ایک طوائف کے اندر کی پاک صاف عورت کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اس عورت کے ساتھ قاری اپنے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔

امراؤ جان ادا میں مرزا رسوا نے لکھنو کی منہدم ہوتی ہوئی تہذیب کو ایک طوائف کی نظر سے دیکھا ہے۔ گو ۱۸۸۰ء میں سرشار نے بھی اِسی لکھنو کے نقشے کھینچے مگر لکھنو کے جس عہد کو مرزا رسوا نے اپنا موضوع بنایا ہے، اس عہد کا منظر نامہ طوائف کے وجود کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ طوائف کے لفظ کے ساتھ مہذب، تہذیب یافتہ، شعر گو، شعر فہم، سخن شناس اور شیریں گو شخصیت کا خاکہ ابھرتا تھا۔ یہ فن اور تہذیب اس مخصوص طبقے کے ذریعے پورے معاشرے تک پہنچتی تھی۔ بقول سید وقار عظیم:

"امراؤ جان ادا" کا پس منظر لکھنو کا وہی انحطاط پذیر معاشرہ ہے جس کی مصوری سرشار نے فسانۂ آزاد میں کی ہے اور اس طرح کی ہے کہ اس معاشرے کے جسم و جان کو حیاتِ جاوداں حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن فسانۂ آزاد ایک مخصوص معاشرے کے بے شمار گوناگوں پہلوؤں کا مرقع ہونے کے باوجود فن کے اُس حسن سے عاری ہے جو کسی ادبی اور فنی شہ پارے کے مطالعے اور مشاہدے کا فوری نتیجہ ہوتا ہے۔" ۲۱

سید وقار عظیم کے مطابق سرشار کی نسبت رسوا نے اُس زوال پذیر معاشرت کی زیادہ نمایاں تصویر پیش کی ہے جو طوائف کے کوٹھے پر آکر سمٹ گئی ہے۔ یہاں ایک اور ذکر ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ سرشار نے "فسانۂ آزاد" میں لکھنو کی تہذیب و تمدن کے ہر رنگ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھنو کے مٹتے ہوئے تمدن میں زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو رکھا ہے، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیلاً کیا جا چکا ہے۔ جب کہ مرزا رسوا نے اسی زوال پذیر لکھنوی معاشرت اور عہد میں طوائف کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے غدر کے آس پاس کے زمانے کے لکھنو میں طوائف کے ادارے کی اہمیت اور فروغ پر روشنی ڈالی ہے۔

امراؤ جان ادا، رسوا کی ناول نگاری کی پہچان ہے۔ ناول کا مرکزی کردار امراؤ جان ہے۔ امراؤ جان فیض آباد کے ایک جمعدار کی کنواری بیٹی تھی، امیرن نام تھا۔ اس کے باپ کا دشمن دلاور خان، اُسے ایک دن موقع پا کر پکڑ کر لے گیا اور لکھنو میں خانم جان طوائف کے ہاتھوں سوا سو روپے میں فروخت کر دیا۔ رفتہ رفتہ امیرن بھی ایک مکمل طوائف بن گئی اور امراؤ جان ادا کے نام سے مشہور ہوئی، لیکن اس کے اطوار و عادات، عام طوائفوں سے مختلف تھے، اس لیے کہ اس کے اندر نسلی شرافت موجود تھی اور اسے مجبوراً طوائف بننا پڑا تھا۔ ایک مجرے کے لیے وہ لکھنو سے فیض آباد بھی گئی اور اپنی والدہ اور بھائی سے ملاقات بھی ہوئی لیکن چار و ناچار واپس لکھنو چلی گئی۔ آخر میں گانے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور طوائف کے پیشے سے تائب ہو گئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری امراؤ جان ادا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"(امراؤ جان ادا) اس مختصر خاکے میں معاشرتی زندگی خصوصاً اودھ کے زوال پذیر تمدن کی بہت بڑی داستان پوشیدہ ہے۔ اس داستان کو مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا کی زبانی جس کامیابی سے سنوایا ہے، وہ فنِ کردار نگاری پر ان کی کامل دسترس کا ثبوت ہے۔" ۲۲

بے شک! امراؤ جان ادا کا کردار اردو کی کرداری ناول نگاری میں اہم ترین کردار ہے۔ یہ پہلا سنجیدہ کردار ہے جو اپنی زندگی کا ضامن ہے۔ اس ناول میں جہاں حقیقت نگاری کا تڑکا ہے وہیں ایک زوال پذیر معاشرت کی عکاسی بھی ہے۔ یہاں سماج، تہذیب، تاریخ، سیاست، نوابی عہد اور غدر کے بعد کی صورت حال بھی بیان کی گئی ہے۔

رسوا کا موضوع لکھنو کے آخری دور کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتا ہے۔ طوائف کے وسیلے سے انھوں نے کوٹھے کے محدود ماحول کے ذریعے ایک ایسی زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے جہاں معاشرتی حقیقتوں کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی کڑواہٹ، رومان اور دردناکی کے پہلو بھی ہیں۔ ناول میں رسوا نے دو زمانوں کو دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک نوابی عہد کا زوال اور دوسرا ۱۸۵۷ء کے بعد کا لکھنو۔ انھی دونوں ادوار کے رنگوں کی آمیزش سے لکھنو کا ماضی اور موجودہ معاشرہ سامنے آتا ہے۔

زندگی کی بے عملی اور اقدار کی تبدیلی نے لکھنو کی اعلیٰ تہذیب یافتہ معاشرت کو زوال آشنا کر دیا تھا۔ زندگی کی تلخ و تاریک حقیقتوں کو قبول کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس تہذیب کے لوگوں نے رنڈی کے کوٹھے پر پناہ لینے کی کوشش کی۔ طوائف کا کوٹھا تہذیبی مرکز تھا اور وفا و محبت کی بجائے وہ طوائف کا کوٹھا ہی تھا جہاں خواتین کے ساتھ رنگ رلیاں، آزادانہ گفتگو، ادبی ذوق کی تسکین اور اربابِ نشاط معیار قرار پایا۔ امراؤ جان ادا کی کہانی اس عہد اور مسلمانوں کی مٹتی ہوئی تہذیب کی کہانی ہے جس میں مسلمان تہذیب کا حسن بھی ہے اور وہ خامیاں بھی جو عیش و عشرت کی زندگی نے پیدا کر دی تھیں۔ یہ وہ تہذیب تھی جس نے برصغیر میں مسلمانوں کے تقریباً آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں مسلم اور ہندو کلچر کی ارتقائی تہذیبی آمیزش سے جنم لیا تھا۔

ایک معاشرتی کرداری ناول زندگی کے حقائق کی فنکارانہ اور فکری سطح پر عکاسی کا تقاضا کرتا ہے، اس میں ایک مربوط معاشرت کو دکھاتا ہے۔ تاکہ مکمل کردار نگاری، پلاٹ، کرداروں کی نفسیات اور رجحانات، اپنے بیان کردہ عہد کی مکمل تصویریں واضح طور پر اس میں دیکھی جا سکیں۔ رسوا نے بھی اپنے اس مکمل اور پکا رسک (کرداری) ناول میں ایک مخصوص فرد، امراؤ جان ادا کو لے کر اس کی زندگی کے حالات، گزرے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق بھی دکھائے ہیں۔ جیسے اُس دور میں طوائف کی زندگی میں وہ دن بڑا قابلِ دید ہوتا تھا، جس دن وہ مسی کی رسم ادا کرتی تھی۔ اس رسم کے بعد اسے طوائف ہونے کا باقاعدہ سرٹیفکیٹ مل جاتا تھا۔ اس کے لیے الگ کمرہ سجایا جاتا تھا۔ رسوا نے طوائف کے سجائے گئے کمرے کا نقشہ بہت عمدگی سے کھینچ کر تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے:

"نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری چاندی کھینچی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان، مقابے، حسن دان، خاصدان، اگلدان اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں... سرِ شام سے دو کنول روشن ہو جاتے، دو دو مہربان، دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔" ۲۳

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

رسوانے زمان و مکان اور عورت کی نفسیات کو بڑی زیرکی کے ساتھ پیش کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہ اس عہد میں طوائف کی قدر و قیمت کیا تھی؟ وہ کس طرح معاشرے میں مرکزی کردار ادا کر رہی تھی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کہتے ہیں کہ:

"امراؤ جان ادا ایک طوائف کی آپ بیتی کے رنگ میں چکلے کا انسائیکلوپیڈیا ہے اور رنڈی اور رنڈی پنے کے متعلق جملہ معلومات فراہم کرتی ہے۔" ۲۴

ڈاکٹر سہیل بخاری کی رائے اپنی جگہ ہے مگر رسوانے طوائف کے کوٹھے کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے قاری کو اس سماج اور تہذیب کے متعلق جملہ معلومات فراہم کر دی ہیں۔ مثلاً طوائف بننے کے کئی اسباب ہوتے ہیں: بعض خانم کی بیٹی بسم اللہ کی طرح پیدائشی طوائفیں ہوتی ہیں، کچھ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر زبردستی اغوا کر کے اس بازار میں بیچ دیا جاتا ہے، جو آخر میں طوائف بن جاتی ہیں، جیسے امیرن اغوا ہونے کے بعد امراؤ جان کے روپ میں منظر عام پر آتی ہے۔ کچھ والدین غربت اور افلاس کی وجہ سے بھی اپنی اولاد کو اس جہنم میں دھکیل دیتے ہیں، جیسے آبادی جان جسے امراؤ نے خریدا تھا۔ پلاٹ کے اعتبار سے بھی امراؤ جان ادا ایک تراشیدہ ہیرا ہے، جس کا عکس لطیف اور نہایت موزوں ہے۔ یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس کا پلاٹ تعمیری ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

"ناول کا پلاٹ نہایت مربوط اور متناسب ہے... اور چونکہ رسوانے ربط باہمی ہی کو انتخاب واقعات کا معیار قرار دیا ہے۔" ۲۵

کردار نگاری میں بھی رسوانے اپنی فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ جس کا اظہار پلاٹ میں نظر آتا ہے۔ رسوا ایک کامیاب نفسیات دان بھی ہیں۔ انھیں کرداروں کے اندر کا تجزیہ کرنے میں پوری مہارت حاصل ہے۔ انسانی کشمکش کے بیان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانی کردار کو بگاڑنے میں ماحول اور صورت حال کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ کہانی میں نامیاتی روجس طرح فطری تسلسل کے ساتھ قائم ہے، اس کے باعث کرداروں کا انتخاب اور ان کے کرداروں کی پہلو داری ظاہر ہوتی ہے۔ خانم ایک نائیکہ ہے جسے گناہ کا خوف تو ہے لیکن پھر بھی ایسا کام کرتی ہے کیونکہ اس وقت لکھنوی ماحول اور صورت حال کو ایسی خانم ہی کی ضرورت تھی۔ گوہر مرزا جو صرف ڈومنی کی بد کرداری کی ہی شناخت نہیں بلکہ وہ نوابوں کے مجرمانہ خیال اور ان کی بد کرداری کا نمائندہ بھی ہے۔ ظاہری طور پر تو وہ اس لکھنوی معاشرے سے نفرت کرتا ہے لیکن کوٹھے کا سہارا لے کر امراؤ جان سے چوری چھپے عشق بھی لڑاتا ہے۔

رسوا کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے کرداروں کی مثالیت پسندی ختم کر کے انھیں نفسیاتی کیفیت کا آئینہ دار بنایا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے امراؤ جان ادا کی کردار نگاری کے حوالے سے رسوا کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امراؤ جان ادا ایسا موثر کردار ہے کہ انفرادیت کے باوجود طوائفوں کے طبقے کے لیے استعارہ بھی قرار پاتی ہے۔ اُس صدی کا آغاز امراؤ جان ادا سے ہوا اور خوب ہوا۔" ۲۶

مرزا رسوانے ایک کردار کے ذریعے جس طرح پورے سماج کو آشکار کیا ہے وہ کرداری ناول نگاری میں ایسا کمال ہے جس کے لیے رسوا ہمیشہ ادب میں یاد رکھے جائیں گے۔ امراؤ جان ادا ناول کے کردار ایک خاص معاشرت اور ماحول کی تشکیل کرتے ہیں، ان میں کوئی کردار ایسا نہیں جو ناول کی تکمیلی وحدت کا حصہ نہ ہو اور یہ بڑا فن ہے جو مرزا رسوا سے پہلے کسی اردو ناول نگار کے ہاں موجود نہیں ہے۔ مرزا رسوا کی کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر میمونہ انصاری لکھتی ہیں:

"جہاں تک امراؤ جان ادا کے کرداروں کا تعلق ہے، رسوانے ہر کردار بڑے سلیقے اور ہوش مندی سے تخلیق کیا ہے اور اس ناول کے کردار عموماً صاف اور سڈول ہیں ... کچھ کردار زندہ ہیں اور دائمی بھی ہیں۔ امراؤ جان ادا میں دو قسم کے کردار ہیں۔ ایک وہ کردار جو پورے قصے پر حاوی ہیں اور ناول کے اندر زیادہ دیر تک رہتے ہیں۔ دوسرے وہ کردار جو ناول میں مختصر عرصے کے لیے آتے ہیں، اپنا کام کر کے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن دونوں قسم کے کرداروں کی اہمیت میں کوئی کلام نہیں۔ اس ناول کا ادنیٰ سے ادنیٰ کردار بھی ناول کے ضروری عنصر یعنی نظریہ حیات کو واضح کرتا ہے... حیرت ہوتی ہے کہ پوری ناول میں ایک کردار بھی بھرتی کا نہیں۔" ۲۷

کہانی کا مرکزی کردار امراؤ جان ادا لکھنوی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس کردار سے قاری کو ہمدردی پیدا ہوئی کیونکہ کم عمری میں مصیبتوں اور مشکلات کے پہاڑ گر جانے کے باوجود ذہانت اور سمجھ داری سے کام لیتی ہے۔ اس کردار کی تعمیر و تشکیل میں رسوانے اپنی فنی خوبیوں کا ثبوت دے کر اس کردار کو امر بنا دیا۔ امراؤ جان کے بچپن کی کہانی حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ دلاور خان کا امیرن کو اٹھانا اور خانم کے ہاتھ فروخت کر دینا اس قسم کے سانحات نہ صرف اس عہد میں وقوع پذیر ہوئے تھے بلکہ آج کا معاشرہ بھی ان سانحات سے محفوظ نہیں ہے۔ رسوا کے مناظر جیتے جاگتے اور جذبات کی تصویر کشی میں انھیں کمال حاصل ہے۔ امراؤ کا خانم کے کوٹھے پر واپس آنا، فیض آباد میں گزرا ہوا بچپن، طوائف کے کمرے کی آرائش و تزئین، امراؤ کے گھر واپس لوٹنے پر بھائی کا غصے میں بھرا ہونا یہ ڈرامائی کیفیات ہیں۔ امراؤ جان ادا کے کردار وار اس کے اطراف میں نفسیاتی کیفیت کو ڈاکٹر میمونہ انصاری نے یوں لکھا ہے:

"امراؤ جان کا کردار اردو زبان میں اہم ترین کردار ہے۔ یہ پہلا سنجیدہ کردار ہے جو اپنی زندگی کا ضامن ہے۔ اب تک ایسا کردار تخلیق نہیں ہوا... وہ پیدائشی طوائف نہیں تھی، ایک شریف گھرانے میں ایک شریف ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی۔ شریف باپ کے سائے میں زندگی کی نو بہاریں گزاریں۔ ایک ڈاکو نے اسے اغوا کیا اور خانم کے ہاتھ بیچ ڈالا، جہاں تعلیم و تربیت کے بعد اس کو طوائف بنا دیا گیا، خود شاعرہ تھی، ادب سے دلچسپی رکھتی تھی، قبول صورت تھی، گانے میں ماہر تھی، اس لیے اپنے زمانے کی بڑی رنڈیوں میں شمار ہونے لگی، جہاں جاتی تھی سر آنکھوں پر بٹھائی جاتی تھی۔" ۲۸

امراؤ جان ادا کے کردار میں رسوانے ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو خانم کی محرومیوں سے پاک ہے کیونکہ خانم خالص کاروباری عورت ہے، اس کے مزاج میں سختی، طبیعت میں خشکی اور مکاری کا عنصر غالب ہے۔ اس کے دل میں خوف خدا بھی ہے اور دولت کا لالچ بھی، جو پکے رنڈی پن کی علامت ہے۔ امراؤ جان پیدائشی طوائف نہیں، اس کے پاس کوئی اخلاقی پیمانہ نہیں۔ وہ محض انسان ہے اور سلامت روی سے کام لیتی ہے۔ کردار کے حوالے سے بوا حسینی ایک نیک عورت ہے جو امراؤ جان کو محبت اور شفقت دے کر ماں باپ کی یاد کو بھلانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

امراؤ جان ادا، اس ناول کی ہیروئن ہے، اس میں کوئی ہیرو نہیں ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے یہ سوال اٹھایا ہے اور گوہر مرزا، راشد علی، فیضو، نواب سلطان جیسے کرداروں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد خورشید الاسلام اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: "(اس میں) کوئی ہیرو نہیں ہے: سب معاشرتی جبر کا حصہ ہیں۔" ۲۹ ناول میں ہیرو کوئی نہیں ہے، معاشرتی جبر ہی ہے۔ جبر کے ساتھ زوال کا بھی دور دورہ ہے۔ ستم بالائے ستم، فرد اور سماج دونوں لمبی تان کر سوئے ہیں۔ نواب سلطان، نواب چھبن، فیضو، مولوی، نواب جعفر علی، دلاور خان، امراؤ جان کا بھائی اور دیگر کردار زندگی کے مختلف چہرے ہیں جو زندگی کے اسٹیج پر ہمیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے ذریعے ظلم اور ناانصافیوں کا ادراک ہوتا ہے۔ معاشرے میں اچھائی اور برائی میں تفریق کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمیں عروس البلاد لکھنؤ کی ظاہری چمک دمک اور تعشیاتی زندگی کے پس پشت جبر و استحصال کی قوتیں ان کرداروں کے ذریعے ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں کہ:

> "اس پُر تصنع اور پر تکلف معاشرے میں وضعداری اور پاسداری ان رؤسا اور نوابین کا شعار ہے، نواب سلطان جیسے لوگ بھی موجود ہیں، جو اپنی جائیدادوں کو برقرار رکھنے کے لیے انگریزوں سے مراسم قائم کیے ہوئے ہیں، راشد علی جیسے نو دولتیے بھی ہیں جن کی فضول خرچی ان کے باپ کی لوٹ کھسوٹ کی مرہون منت ہے، دلاور خان جیسے دلال بھی ہیں، جو لکھنو کے نواحی گاؤں اور قصبوں سے لڑکیاں اٹھا کر لکھنو کے کوٹھوں پر فروخت کرتے ہیں اور فیضو جیسے مشورہ پشت اور جری ڈاکو بھی ہیں جو اس نام نہاد مہذب اور شائستہ معاشرے سے اپنی قوت کے بل پر خراج وصول کرتے ہیں۔" ۳۰

یہاں اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی قوم کی برائیاں ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے ان برائیوں کا ادراک ضروری ہے جب تک کسی قوم کو اپنی برائیوں کا احساس نہیں ہوگا، اسے دور نہیں کیا جا سکتا۔ برائیوں کا احساس دلانا ہی ادب کا اصل کردار ہے۔

رسوا نے ناول میں ایک طوائف کی سرگزشت ہی نہیں لکھی بلکہ اپنے عہد کی تاریخ اور تہذیب کو بیان کیا ہے۔ حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ لکھنو کے معاشرے میں طوائفوں کو کیا مقام حاصل ہے، پھر بھی پورے لکھنو کی زندگی کو سمیٹنے کے لیے وہ طوائف کو بلند درجہ دیتے ہیں۔ اس کے کوٹھے پر سماج کے سارے نمائندوں کو سمیٹ لاتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے سے کچھ پہلے کی زندگی پیش کرتے ہیں جب ابھی مشرقی تہذیب زندہ ہے۔ رسوا ہمیں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد کے حالات کی سیر کراتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈھنگ سے ناول کو سائنسی نظریے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ وہ خانم کے کوٹھے کا ذکر، وہاں کی مکتبی تعلیم، موسیقی اور طوائف بننے کے مراحل کا ذکر کرتے ہیں، جس سے قارئین میں گہرا احساس شعور ابھرتا ہے۔ طوائفوں کے عاشقوں کا بیان کر کے وہ لکھنو کے شرفاء اور نوابین کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں، اسی دوران وہ ہمیں عام عوامی رنگ سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کے بقول:

> "اس ناول میں انسانی زندگی کی تاریخ اور رومانوی پہلو کا ایسا نپا تلا امتزاج ہے جو کسی بھی دوسرے ناولوں میں نظر نہیں آتا... انھوں نے معاشرت کی عکاسی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کر لیا اور دوسرے کرداروں کے احساسات اور جذبات کو بھی پوری طرح پیش کیا ہے۔" ۳۱

ناول میں زندگی کی رنگارنگی ہے جو اسے انفرادی شان بخشی ہے۔ ناول میں شروع سے لے کر آخر تک شعریت، ڈرامائی حرکت اور عمل پایا جاتا ہے۔ امراؤ جان کا اغوا ہونا، خانم کے ہاتھوں فروخت ہونا، فیضو کا درمیان میں امراؤ جان کو لے اڑنا، مجلسی زندگی، کرداروں کی نوک جھونک، مکالمے اور حاضر جوابی، ان تمام سطحوں پر ناول میں ڈرامائی تسلسل قائم ہے۔ بلاشبہ! یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنوی معاشرت میں بے حسی کی اس زندگی کو بے نقاب کرنے والے مرزا رسوا تعریف کے قابل ہیں کہ انھوں نے ایک سماجی اور اخلاقی جہت کو خوبصورتی سے ادب کی روایت میں ابھارا ہے۔

ان تمام پہلوؤں سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو کرداری ناول نگاری کی تاریخ میں امراؤ جان ادا کی شخصیت کی تعمیر اور مرحلے وار زندگی رسوا کا شاہکار ہے۔ امراؤ جان کا کردار، کردار نگاری کا کمال کہا جائے گا۔ یہ سپاٹ (Flat) کردار نہیں ہے۔ یہ پہلو دار (Round) کردار ہے۔ اس میں امراؤ جان کی زندگی کو کئی واقعات، سبق آموز اور مرحلے وار پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد امراؤ جان کی کردار نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "ماضی کی امراؤ جان ادا کے کردار کا ایک یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے اور وہ ہے اس کے باطن سے ابھرنے والے خیالات اور تاثرات، اس نو سالہ معصوم بچی کے اغوا کے بعد اس کے طوائف ہونے کے باوجود اس کے کردار کی پہلو داری (Being Round) کا بھرم رکھ لیتے ہیں۔ ناول کے آخیر میں اس کی یہ قابلِ ذکر مثال ہے: "یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لیے برا ہے خصوصاً رنڈیوں کے لیے۔ رنڈیوں کے لیے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔" ۳۲

اردو ادب کی روایت میں امراؤ جان ادا لکھنوی تہذیب و معاشرت کی ایک علامت بن کر زندہ رہے گی۔ یہ فنتسائی (Fictionious) کردار ہے، جو بذاتِ خود ایک علامت بن جاتا ہے۔ رسوا نے پہلی بار کرداری ناول نگاری کی روایت میں کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کی ہے۔ بقول ڈاکٹر مجتبیٰ حسین: "اس ناول میں طوائف نہ صرف ایک سماجی علامت ہے بلکہ وہ معصومیت کا المیہ بھی بن جاتی ہے۔" ۳۳ یعنی اس معاشرے میں خیر و شر کا ہی زوال تھا، وہاں معصومیت کو اغوا بھی کیا جاتا تھا، بیچا بھی جاتا تھا اور پھر بھلا دیا جاتا تھا۔ یہ ناول معاشرتی خیر و شر کی بھی علامت ہے۔ امراؤ جان ادا کی کردار نگاری کو ابھی اور ہزار رنگ سے لکھا، دیکھا اور دکھایا جا سکتا ہے مگر طوالت کے ڈر سے اس موضوع کو یہیں ختم کرنا ہوگا۔

گزشتہ صفحات کے تنقید و تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا رسوا نے اس معرکہ آرا معاشرتی ناول میں کردار نگاری، معاشرتی تصویر کشی، انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی کو بنیاد بنا کر ایک شاہکار ناول لکھا جو کرداری ناول نگاری کے تمام فنی لوازم کی تکمیل کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس میں ۱۹ ویں صدی کے لکھنو کے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی پس منظر اور المیے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مرزا نے اپنے پیش رؤں کے برعکس اردو کرداری ناول نگاری کی تاریخ میں ایک نئی صحت مند، توانا روایت کی بنیاد ڈالی۔ احسن فاروقی نے درست کہا ہے کہ:

> "امراؤ جان ادا کی ہر صنف اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ ناول کے ہر ناظر کو اپنا مذاق پختہ کرنے کے لیے اس سے شروع کرنا چاہیے اور ہر فن کار کو اس پر حاوی ہو کر قدم آگے بڑھانا چاہیے۔" ۳۴

کئی چاند تھے سر آسماں (۲۰۰۶ء)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی کا یہ نایاب ناول ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا، جس نے آتے ہی ہر طرف ہلچل مچادی۔ انھوں نے اس ناول کے توسط سے ایک مخصوص عہد کی تہذیب و معاشرت کو تاریخی تناظر میں نہایت ہنر مندی اور جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ''کئی چاند تھے سر آسماں'' شمس الرحمن فاروقی اپنی فکشنیاتی (Fictinious) صلاحیت اور وزیر خانم کی کردار نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں ایک طویل عرصے تک دادِ تحسین وصول کرتے رہیں گے۔ اس ناول میں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کی انتہائی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے لیکن وسیع تر تناظر میں یہ ناول بلاشبہ ایک سماجی اور تاریخی حوالہ بھی رکھتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ میں نے اس کتاب میں مندرج تمام اہم تاریخی واقعات کی صحت کا حتی الامکان مکمل اہتمام کیا ہے لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے، اسے اٹھارہویں، انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب، انسانی اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہے۔'' ۳۵

اس ناول کو وہ ''اٹھارہویں، انیسویں صدی کے ہند مسلم کلچر کا مرقع'' کہتے ہیں، حالانکہ یہ ایک معاشرتی ناول ہی ہے، اسے انھوں نے کہیں بھی تاریخی ناول تسلیم نہیں کیا۔ شمس الرحمن فاروقی ایک جدید فن کار ہیں جو فکشن میں تجربات کے حامی رہے ہیں، اس لیے انھوں نے دستاویزی تکنیک کے سہارے سے اس ناول کا خمیر اٹھایا ہے۔

کئی چاند تھے سر آسماں، ایک نسوانی کرداری ناول ہے، جو داغ دہلوی کی والدہ وزیر خانم کی زندگی کا المیہ بیان کرتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس ناول میں دستاویزات کے سہارے، اپنی بنائی ہوئی مخصوص ہیئت اور عہد میں مشہور شاعر داغ دہلوی کی والدہ وزیر بیگم کی قابلِ توجہ اور قابل بحث زندگی کا نوحہ لکھا ہے۔ مشہور زمانہ ناول نگار انتظار حسین نے اس ناول کو اردو ادب کی دنیا میں صرف ہلچل سے ہی تعبیر نہیں کیا ہے بلکہ اسے ''امراؤ جان ادا'' جیسے شاہکار ناول کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار وزیر خانم کی تخلیق شمس الرحمن فاروقی کی سب سے بڑی کاوش ہے۔ وزیر خانم کی کردار نگاری کر کے انھوں نے کرداری ناول نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس کے لیے وہ ہمیشہ دادِ تحسین وصول کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، کئی چاند تھے سر آسماں میں فاروقی کی کردار نگاری کو یوں سراہتے ہیں:

''...وزیر خانم جو کہ داغ دہلوی کی والدہ تھیں، ان کی صحیح معنوں میں کردار نگاری کا حق انھوں نے ادا کر دیا ہے۔ وزیر خانم نسوانی کردار ہے اور عورت کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ اس میں ان گنت اسرار پنہاں ہیں جن کو آسانی سے بوجھ پانا مشکل ہوتا ہے۔ فکشن کے حوالے سے یہ تصور بھی عام ہے کہ خاتون ناول نگار، عورت کی کردار نگاری کے فن میں مرد ناول نگار پر فوقیت رکھتی ہے، ان خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں اہم نسوانی کرداروں کی نفسیاتی تحلیل قابلِ ذکر رہی ہے، تاہم شمس الرحمن فاروقی کو بھی یہ ہی اختصاص حاصل ہے۔ جہاں تک ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا تعلق ہے اسے پڑھ کر اکثریت اسی نتیجے پر پہنچے گی کہ شمس الرحمن فاروقی نے وزیر بیگم کے کردار میں اعمال و افکار کی متعدد دلچسپیاں بھر کر اسے یادگار بنا دیا ہے۔'' ۳۶

شمس الرحمان فاروقی کا یہ معاشرتی کرداری ناول اٹھارہویں صدی کے راجپوتانے سے شروع ہو کر دہلی کے لال قلعہ میں ختم ہو جاتا ہے، جو تقریباً ایک صدی سے کچھ زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہند اسلامی تمدن، انسانی تہذیب و ادبی معاشرہ، انگریزوں کی سیاسی چیقلش، اس دور کی بدلتی ہوئی زوال پذیر تہذیب اور تاریخی پیکر کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں اٹھارویں صدی کے دل شکن تہذیبی، تاریخی، معاشرتی، سماجی، معاشی اور سیاسی رجحان کا بیان ہوا ہے۔ وزیر خانم، یوسف سادہ کار کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اس کی دو بڑی بہنیں اپنی جگہ مطمئن زندگیاں گزار رہی تھیں اور اپنی قسمتوں پر شاکر تھیں۔ وہ اپنی سماجی اور معاشی حدود سے باہر نکلنے کے جذبے سے عاری تھیں مگر وزیر خانم جو کہ کشمیری حسن کا شاہکار تھی۔ یہ حسن و ادا کی پیکر تھی، مزاجی نفاست، نازو نخرا، ذوق و شوق، شاعری اور حسن گفتار نے اس کی شخصیت کو اور پر کشش بنا دیا تھا۔ اس کے جسمانی خدوخال اور ناک نقشہ مردوں کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔ پروفیسر علی حیدر ملک نے اپنے مضمون میں وزیر خانم کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''وزیر خانم دراصل اونچے خواب دیکھنے والی عیش و عشرت کی دلدادہ، ایک پُر عزم عورت تھی، جس نے اپنے حسن جوانی اور جنسی کشش سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں اس نے شریعتِ قانون اور معاشرتی قدروں کی پامالی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔'' ۳۷

وزیر خانم کی تدبیر بھی یہی ہے اور اس کی زندگی کا المیہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے، جس کا سامنا اُس نے ہر شکست و ناکامی کے بعد کیا۔ وزیر بیگم کی زندگی میں یکے بعد دیگرے پانچ مرد آئے۔ پہلا مرد مارسٹن بلیک تھا، جو کمپنی بہادر کا ملازم تھا۔ مارسٹن، وزیر بیگم کو لے کر جے پور چلا جاتا ہے، جہاں دو بچوں کی پیدائش کے بعد وہ وزیر خانم سے نکاح کی تیاری کر رہا تھا کہ داروگیر، یا یوں کہیے کہ بلوے میں مارا گیا اور یہیں سے وزیر بیگم کی زندگی کا پہلا المیہ شروع ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں:

''اونچے خواب اور آسمان کو چھوتی ہوئی آرزومندی کی پہلی مثال مارسٹن بلیک سے اس کی پہلی شادی تھی تاکہ وہ معاشرے میں غرور اور تمکنت کے ساتھ زندگی گزار سکے کہ ایک انگریز عہدے دار کی بیوی ہے حالاں کہ وہ اس زمانے کی روایت کے تحت کنیز، رکھیل یا بے نکاحی گھر والی تھی۔'' ۳۸

اُس دور کی روایت کے مطابق عورت کو بغیر نکاح کے ہی ساتھ رکھا جاتا تھا، خواہ عورت کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ ہو اور نام و نسب کے لیے بچے بھی پیدا کیے جاتے تھے۔ بلیک کے مرنے کے بعد اس کی بہن نے دونوں بچوں کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا اور اسے جائیداد سے بھی کوئی حصہ نہ ملا کیونکہ بے نکاحی بیوی تھی۔ یہ پہلی محبت اور بچوں کے بچھڑنے کا المیہ اُسے افسردہ کر گیا۔ وزیر خانم کی زندگی میں دوسرا مرد ایک انگریز افسر ولیم فریزر آتا ہے جو ایک ظالم اور عیاش افسر تھا، اس کا کردار ناول میں ویلن جیسا ہے۔ یہیں پر وزیر خانم کے نصیب میں نواب شمس الدین بھی آئے، یہ وزیر خانم سے بہت محبت کرتے تھے، مگر نکاح کا تکلف انھوں نے بھی نہیں کیا تھا۔

ولیم فریزر کی قیام گاہ میں مرزا غالب سمیت بڑے بڑے شعرا کی محفلیں جمتی تھیں، وہاں وزیر بیگم بھی اپنے المیے کی افسردگی، مایوسی اور اداسی کو کم کرنے جاتی تھیں، اس کے قدم، دل آویز مسکراہٹ، ہر سوال کا جواب حاضر جوابی سے دینا، اشعار کا جواب زیادہ بہتر اشعار سے دینا، گفتگو میں وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتیں کہ مخاطب عش عش کر اٹھتا اور کوشش کرتا کہ وہ لمحات طویل ہو جائیں۔ ان سب باتوں نے جہاں ولیم فریزر کا دل لبھایا تھا وہیں نواب شمس الدین بھی وزیر بیگم کی زلفوں کے اسیر ہوئے۔ اسی رقابت میں نواب شمس الدین سے جھگڑے کے بعد ولیم فریزر کا قتل ہو جاتا ہے۔ نواب صاحب وزیر خانم کے حسن ادا پر اس قدر فدا تھے کہ ولیم کے قتل کی سازش میں انھوں نے پھانسی پر لٹکنا منظور کر لیا لیکن پیچھے نہ ہٹے۔ نواب شمس الدین کے قتل کے بعد وزیر خانم کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوا اس نے بعد میں داغ دہلوی کے نام سے شہرت پائی۔ اس المیے کا تذکرہ ڈاکٹر ممتاز احمد اس طرح کرتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"مرزا داغ، نواب شمس الدین سے تھے جنھوں نے وزیر بیگم سے باقاعدہ نکاح کیا تھا اور جنھوں نے ولیم فریزر کے قتل کی سازش اور اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں پھانسی پائی لیکن ناول میں وزیر بیگم کے صبر، ضبط اور اپنے ذاتی المیوں کو برداشت کرنے کی جسمانی و ذہنی صلاحیت واقعی لاجواب ہے ورنہ کوئی دوسری عورت ان حالات میں ذہنی توازن کھو بیٹھتی۔ واضح رہے کہ وزیر بیگم شاعرہ بھی تھی، اس کا فارسی زبان و شاعری پر عبور اور خود اردو شاعری کے شعور نے اسے ناقابل فراموش ہستی بنا دیا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی ورثے کو اس نے داغ میں منتقل کر کے ایک اہم شاعر ادب کو دے دیا۔" ۳۹

داغ کے یہاں شعر و شاعری اور اشعار کہنے کا ذوق انھیں اپنی ماں سے وراثت میں ملا تھا۔ داغ کی رسائی قلعہ معلی میں اس وقت ہو گئی تھی جب وزیر خانم نے اپنی (پانچویں) شادی بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے کر لی تھی۔ یہاں پر داغ کو غالب اور ذوق کی شاگردی کے علاوہ دیگر شعرا کی صحبت کا موقع نصیب ہوا۔ فاروقی صاحب نے اس ناول کے ذریعے نہ صرف اٹھارویں، انیسویں صدی کی عکاسی کی ہے بلکہ اس دور کی ادبی زندگی کی بولتی اور جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے لا کھڑی کی ہیں۔ اس دور کے تمام حقیقی کردار، شاعروں کی شعر خوانیاں، قلعہ معلی کی تفصیلات اور سب سے بڑھ کر شعر و شاعری کا بیان، ان سب عناصر نے "کئی چاند تھے سر آسماں" کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اس ناول میں وزیر بیگم کی ٹریجڈی کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے سماج میں نوابوں کا رہن سہن، تہذیبی رکھ رکھاؤ، مشاعروں کی محفل میں شعرا حضرات کی نشست و برخاست اور احترام، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہوار اور رسم و رواج کی تفصیلات ناول میں بکھری پڑی ہیں۔ اُس دہائی میں جو مسائل درپیش تھے، اُن مظالم، سیاسی، سماجی اور جبریں قدروں اور جرائم کا اظہار بڑے واضح انداز میں کیا گیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اپنے داستانوی اسلوب میں کردار نگاری، معاشرت کی عکاسی، منظر نگاری، زبان و بیان اور دیگر تمام جزئیات کو سوا آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس ناول میں موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

وزیر بیگم کی زندگی میں آنے والے چوتھے مرد آغا تراب علی ہیں۔ نواب شمس کی بہن نے شمس الدین کے مرنے کے بعد وزیر بیگم کی پریشانی اور مالی تنگی کو مد نظر رکھتے ہوئے آغا تراب علی کا اس کے لیے رشتہ دے دیا، وزیر نے اُس سے پوچھا:

"اور یہ آغا صاحب کون ہیں؟ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ سنا ہے شیعہ ہیں تو کیا متعہ کریں گے یا نکاح میں لیں گے؟ میرے بیٹے اور میرے بچھڑے ہوئے بچوں کا کیا ہو گا؟" ۴۰

اس دور میں کنیزوں اور عورتوں کو نکاح کے بغیر رکھنے پر معاشرے کے کان پر جوں تک کا نہ رینگنا ایک بہت بڑا سماجی المیہ تھا، جس کی عکاسی وزیر بیگم کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ وزیر بیگم پہلی بار (باقاعدہ) آغا تراب علی کے نکاح میں آئیں اور ان سے ان کی اولاد بھی ہوئی لیکن جب بدقسمتی سایہ کی طرح پیچھا کر رہی ہو تو وہاں انسان بے بس اور لاچار نظر آتا ہے۔ آغا تراب علی بھی ایک سفر کے دوران ٹھگوں کے ہاتھوں جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

"ٹھگی" اٹھارہویں صدی کی تیسری دہائی کا ایک خوفناک اور دل دہلا دینے والا عمل اور جرم ہے، جس کی عکاسی فاروقی صاحب نے اس ناول میں بڑے واضح انداز میں کی ہے۔ ٹھگی کے سلسلے میں اردو ادب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور سماجی و سیاسی تاریخ میں انگریزوں کا اس خوف ناک اور دردناک نظام کے خلاف ایکشن بھی موجود ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا کمال ہے کہ انھوں نے ٹھگوں کی آغا تراب علی کے خلاف واردات کی جس انداز میں عکاسی کی ہے اسے لرزہ خیز ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس تناظر میں اگر کوئی بھی حکمران ٹھگوں کے تمام افراد بمعہ بچگان سرعام قتل کرا دیتا تب بھی اس کی ہمدردی میں کوئی آواز نہ اٹھتی کہ وہ انتہا سے زیادہ ظالم، مکار اور شقی القلب تھے۔

شمس الرحمن فاروقی نے دستاویزی رجحان کے تحت اُس سماج میں ایک طویل عرصے سے چلے آ رہے اس ظالمانہ پیشے سے متعلق ٹھگوں کا خاندان، اُن کے تربیتی نظام اور حال چال کا بیان کیا ہے اور یہ بھی کہ ایسا کرنے پر اُن کے یہاں ندامت کا کوئی گزر نہ تھا۔ ایک مقام پر ناول میں انھوں نے ٹھگوں کے طریقۂ واردات کا یوں بیان کیا ہے:

"انھوں (آغا تراب علی) نے سن رکھا تھا کہ گھڑ سواروں پر قابو پانے کے لیے دو کے بجائے تین ٹھگ حملہ کرتے تھے۔ ایک گھوڑے کی راس کو پکڑ لیتا ہے، اس قدر مضبوط اور سخت پکڑ کے ساتھ کہ گھوڑا ایک قدم حرکت نہیں کر سکتا۔ دوسرا ٹھگ سوار کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے کھینچ لاتا ہے اور تیسرا ٹھگ سوار کے گرتے گرتے اپنے آلۂ قتل، یعنی سفید اور زرد پٹیوں والے کپڑے کے انگوچھے (ٹھگوں کی اصطلاح میں رومال) سے چشم زدن میں اس کا گلہ گھونٹ دیتا ہے۔ شکار کو تڑپنے کی بھی مہلت ٹھیک سے نہیں ملتی۔" ۴۱

آغا تراب علی کے ساتھ سفر میں جو واقعہ پیش آیا وہ یہاں لکھنا اس لیے بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ وزیر بیگم کے المیہ کی گہرائی کو سمجھا جا سکے، اور اس دور کے اس سماجی المیہ کا تعین بھی ہو سکے۔ واضح رہے کہ اس زمانے کے ظالم ٹھگ عیسائی، ہندو، مسلمان یا کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کا روپ دھار کر لوگوں کے سامنے جاتے تھے کہ یہ پیشہ ور لوگ تھے۔ مرزا آغا تراب علی نے جہاں دھوکا کھایا وہ مسلمان سپاہیوں کا ایک گروہ تھا، جن کے ساتھ زمین پر ایک مردہ پڑا ہوا تھا اور اس کی نمازِ جنازہ کے لیے وہ سپاہی پریشان کھڑے تھے۔ آغا تراب علی ان کی باتوں میں آ گئے، انھوں نے جیسے ہی نماز جنازہ پڑھانی شروع کی کوئی بولا "تماکو کھا لو" یہ آواز بلند ہوتے ہی مردہ اچانک اچھلا اور آغا تراب علی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، اس نے پھر اپنی گردن سے پون گز کا رومال نکالا اور نیولے کی سرعت کے ساتھ رومال کو گھما کر ان کی گردن میں پیوست کر دیا کہ ان کے منھ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ دوسرے ساتھی نے رومال کا سرا اس زور سے کھینچا کہ ان کے نرخرے کی ہڈی شکستہ ہو کر ان کے حلق کی پشت میں دھنس گئی اور وہ زمین پر آ رہے، یہی حال ان کے ساتھیوں کا بھی ہوا۔ جلدی سے ایک گڑھا کھود کر سات لاشیں ایک دوسرے کے اوپر ٹھونس دی گئیں۔ یہ کام کر کے وہ با آواز بلند بولے، "جے دیوی ماں کی" اور سارا مال مویشی اکٹھا کر کے کسی اور جگہ کے لیے سٹک لیے۔

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے داستانوی اسلوب میں تمام جزئیات کو موثر انداز میں بیان کیا ہے، جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹھگی ہی کے سلسلے میں ایک اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے ماہرین بھی تھے جو واردات کی جگہوں پر جاسوسی والے انداز اختیار کرتے ہوئے نہ صرف پہنچ جاتے تھے بلکہ ٹھگوں کو پکڑوا بھی دیتے تھے اور یہاں بھی یہی ہوا۔ جب قبر کشائی کی گئی آگے کا نقشہ دیکھیے:

"اوپر تلے آٹھ قریب قریب ننگی لاشیں، سب سے نیچے مظلوم آغا تراب علی کی لاش تھی۔ دورانِ خون اور سلسلہ تنفس بند ہو جانے کے باعث سب کے بدن پہلے تو اکڑ گئے تھے اور پھر چوبیں گھنٹے یا اس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد دوبارہ نرم پڑ گئے تھے، لیکن اکڑن کے زمانے میں جگہ کی تنگی کے باعث سب لاشیں کچھ نہ کچھ شکستہ اور مسخ شدہ ہو گئی تھیں، بعض کے چہرے ٹیڑھے ہو کر پھر سیدھے نہ ہوئے تھے اور بعض کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں ... جب لاشیں پوری طرح کھل گئیں تو خون اور بدن میں مقید ریاح اور باہر کی غلاظتوں کی بدبوئیں مل کر ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔" ۴۲

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب وزیر بیگم کو یہ اطلاع ملی ہو گی تو اس کا کیا حال ہو گا۔ناول میں یہ سب باریک تفصیلات اور اُس سماج کی ظالمانہ تصاویر بکھری پڑی ہیں۔ ٹھگی کے دلخراش عمل کی جو مثال فاروقی صاحب نے اپنے ناول میں دی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، یہ المیہ وزیر بیگم کے ساتھ ساتھ ہر قاری کے لیے صدمے کا باعث ہو گا۔ لیکن وزیر نے ہمت نہیں ہاری وہ ایک بار پھر دہلی کا رخ کرتی ہیں۔ یہاں پر اس بار ان کے حسن و ادا کے دیوانے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو ہو جاتے ہیں۔ وزیر سے اُن کا نکاح ہو جاتا ہے اور وہ قلعہ معلی آجاتی ہیں۔ یہاں پر تقدیر کا وار انتہائی سخت تھا۔ قلعہ معلی بھی انھیں راس نہ آیا۔ زینت محل نے اقتدار کے ہوس میں مرزا فخرو کو زہر دلوادیا۔ وزیر کے بطن سے مرزا فخرو کا ایک بیٹا پیدا ہوا ہی تھا کہ زینت محل نے اس کی قلعہ بدری کا حکم صادر فرمادیا۔ بہادر شاہ ظفر بھی کچھ نہ کر سکا۔ وزیر خانم کا ملکہ کو جواب دیکھیے:

"میں نے کسی باب میں اب تک ملکہ کو مایوس نہیں کیا۔ اب بھی انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ کے دامن دولت میں جگہ نہیں تو نہ سہی، ہم اور آبادی میں جا کر اپنا مقسوم پائیں گے، خدا خدا، ملک خدا تسلیمات۔" ۴۳

یوسف سادہ کار کی سب سے چھوٹی بیٹی کا طنطنہ اور ولولہ ان الفاظ میں زندہ نظر آتا ہے۔ وزیر خانم کے ساتھ تقدیر نے جو مذاق کیا وہ اس ناول میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس کی شدت ناول کے اس آخری منظر سے ظاہر ہوتی ہے:

"پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر کو جھکائے بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔" ۴۴

وزیر بیگم کا کردار جسے شمس الرحمن فاروقی نے مورتی کی مانند تخلیق کیا تھا، پے در پے حادثات اور سماجی کیفیات و مصائب کی وجہ سے اب وہ کٹی ہوئی پتنگ کی مانند تھی۔ ابتدا سے اب تک پالی ہوئی آرزوؤں اور سنہری یادوں کے شعلے سرد پڑ چکے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

وزیر خانم کے حقیقی مزاج، کردار اور نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس کے کہے ہوئے چند جملے از بس ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص نقطۂ نظر، سماجی ماحول اور تجربہ کاری کی وجہ سے شمس الرحمن فاروقی نے اس مرکزی کردار کے لیے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا ہے جس سے اس کی چالاکی، اعتماد، عزم، چلتر پن اور اس کے اندر بھرے رومانویت کے طوفان کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مثال دیکھیے:

"تعلق وہ اچھا جو توڑا جاسکے... شہزادہ نصیب میں ہے تو ضرور آئے گا۔ ورنہ مجھے جو مرد چاہے گا! اسے چکھوں گی۔ پسند آئے گا تو رکھوں گی، نہیں تو نکال باہر کروں گی۔" ۴۵

شمس الرحمن فاروقی نے فکشن میں اس طرح کے الفاظ مثلاً 'چکھوں گی' استعمال کر کے نہ صرف پرت در پرت وزیر کے کردار کو پورے ناول میں کھولا ہے بلکہ نثر میں انتہائی ہنر مندی اور یادگار کردار نگاری کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے۔ وزیر خانم کا کردار اپنے معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور خانگی تناظر میں دلچسپ، انوکھا اور شاہکار کردار ہے۔ اس پورے ناول میں وزیر کی حرکات و سکنات، خیالات، احساسات، ماحول اور ڈائیلاگ ایک شکستہ سماج اور تہذیب کی اندرونی کیفیات کا پتا دیتے ہیں۔ مثلاً آغا تراب علی سے شادی سے قبل ان کا پوچھنا کہ "متعہ کریں گے یا باقاعدہ نکاح؟" اور پھر مرزا فخرو سے شادی سے قبل اس کی تفتیش اور پوچھ گچھ کہ مرزا فخرو لڑکوں میں تو دلچسپی نہیں رکھتے یعنی وہ جانتی تھیں کہ دہلی میں رہنے والے افراد میں یہ شوق موجود ہے۔ وزیر خانم کے کردار کے حوالے سے ایک اور دلچسپ مثال اس ناول میں موجود ہے کہ وہ اپنی بہن سے مانع حمل دواؤں اور طریقوں کے بارے میں معلوم کرتی ہے کہ اُسے اولاد کی خواہش نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس دبی، مشرقیسوسائٹی میں ان باتوں کا اظہار اچھا فعل نہیں سمجھا جاتا تھا مگر وہ ابتدا سے ہی آزاد خیال کردار کے روپ میں دکھائی گئی تھی۔ وزیر بیگم کی کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد رقم طراز ہیں:

"وزیر بیگم جیسی پر کشش شخصیت کی کردار نگاری میں شمس الرحمن فاروقی نے کمال حاصل کر لیا ہے جس کی بنا پر بے دھڑک اور اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ناول کے ایک سو چالیس سالہ سفر میں، جتنی بھی قابل ذکر ہیروئینیں (Heroins) ابھری ہیں، اُن میں ایک کا اضافہ ہو چکا ہے اور اس بیان کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے!" ۴۶

شمس الرحمن فاروقی کی معاشرتی کردار نگاری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو اس میدان میں انھوں نے اپنا لوہا منوالیا ہے۔ وزیر خانم تاریخ کی دبیز تہہ میں ایک غیر معروف شخصیت کے طور پر دفن تھی، جسے مصنف نے علامتی انداز سے بطور فکشن دیکھا اور دکھایا ہے۔ وزیر کا کردار ایک تاریخی و سوانحی، معاشرتی کردار ہے۔ جو داغ دہلوی کی والدہ اور اردو ادب کی کرداری ناول نگاری میں ایک اہم معاشرتی کردار کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ کردار نگاری کے وصف اور قسم (Type) کے مطابق وزیر بیگم کا کردار پہلو دار ہے، اس میں کئی اوصاف اور فنی خوبیاں موجود ہیں جو وقت اور عہد کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ وزیر بیگم کے کردار کے علاوہ ناول میں تمام کردار جامع، متحرک اور بہترین صفات سے مزین ہیں۔

ناول کے آغاز میں وزیر خانم کا تعارف کروانے کے بعد لندن میں اس کے پڑپوتے وسیم جعفر کی ملاقات ایک ماہر امراض چشم خلیل اصغر فاروقی سے ہوتی ہے۔ وسیم جعفر کے ہاتھوں انڈیا آفس لندن سے وزیر خانم کی تصویر کی چوری اور بعد میں وسیم جعفر کی وصیت تک کے تمام حالات و واقعات بظاہر ناول کی کہانی میں اجنبیت پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ مخصوص تہذیبی و ثقافتی تناظر میں لکھے جانے والے اس قسم کے کرداروں اور واقعات کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ نہ ہی یہ کردار کسی بڑی نمائندہ تہذیب کے نمائندہ ترجمان کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن شمس الرحمن فاروقی ایک زیرک اور مشتاق مصنف ہیں چنانچہ انھوں نے بڑی منصوبہ بندی اور تکنیک سے ایک مختلف تہذیب اور کرداروں کا تذکرہ کر کے مقامی تہذیبی تناظر کو واضح اور نمایاں کیا ہے۔ اس لیے تاریخی عوامل کے ساتھ ساتھ دو مختلف تہذیبی و سماجی اور خارجی عناصر کو اجاگر کرنے کا فریضہ انھوں نے ناول میں انجام دیا ہے۔

یہ ناول مختلف ادوار کی عکاسی اور وزیر خانم کے تہذیب و ثقافتی پس منظر کو گہرائی اور گیرائی سے منظر عام پر لاتا ہے۔ اس دور کی متعلقہ صورتِ حال کو فاروقی صاحب نے حقیقت پسندانہ طریقے سے بیان کیا ہے، جس سے اس ناول کی حقیقت نگاری ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مستعمل زبان، نوابوں کا رہن سہن، تہذیبی رکھ رکھاؤ، مشاعروں میں شعرا حضرات کی شرکت، ادبی سرگرمیاں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر رسوم و رواج، گھروں میں بول و براز کی صفائی کا نظام، نوابوں کی نگرانی میں کام کرنے والی ملازماؤں اور ان کی نوجوان لڑکیوں کے رویے، نوابوں کی ان پر عنایات، بے نکاحی عورتوں کے ساتھ ان کا طرز عمل، ان کی بہادری،

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

جائیدادوں کے تنازعات میں وکیلوں کا کردار، قتل ہونے پر متعلقہ حکام کی تفتیش کی گہرائی، اس زمانے کے مسجدوں کے مولویوں کا طرز عمل۔ اسی طرح انگریزوں کی زندگی، ان کے نو آبادیاتی طرز عمل، گھروں میں بیٹھی ہوئی اللہ والیوں اور ہندو جیوتشیوں سے لوگوں کا رجوع کرنا اور اپنے مسائل و مصائب پر رائے لینا، وزیر بیگم نے بھی ایک اللہ والی اور ہندو جیوتشی سے رابطہ قائم کیا تھا مگر غیب کا حال صرف اللہ جانتا ہے اور وزیر بیگم کا ہر المیہ اٹل رہا۔

شمس الرحمن فاروقی نے قلعہ معلی کے اندرونی ماحول کا نقشہ بھی قابلِ تعریف کھینچا ہے۔ قلعے کی ایک مخصوص زندگی تھی جس سے عام قاری نابلد تھا، مثال کے طور پر بادشاہِ وقت کے سامنے مخصوص اوقات میں شہزادوں اور ان کی بیگمات کا پیش ہونا، الزام تراشی، عورتوں کے چالاکی اور سازشیں، بادشاہِ وقت کا اپنی بیوی کی وجہ سے بے بس اور مفلوج ہونا، قلعے میں ایسے افراد کی بہتات ہونا جو نوابوں اور جاگیرداروں کو اطلاع دیتے کہ فلاں خاتون کنواری یا فارغ بیٹھی ہے، خود وزیر بیگم مرزا فخر و صاحب سے نکاح میں اسی اطلاع کی وجہ سے آئی تھیں۔ ان تمام عناصر کی عکاسی سے ناول میں ایک معاشرتی عہد زندہ ہو گیا ہے اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کی عکاسی اور سماجی و تاریخی کرداری ناول کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی نے اپنے ایک مضمون "کئی چاند تھے سر آسماں" میں بیان کیے گئے عہد کو انحطاط اور پسپائی کا نام دیا ہے:

> "مصنف اگر چاہتا تو اس نیم تاریخی تمثیلچے کو بہت آگے تک لے جا سکتا تھا، جیسا کہ آغاز کے چند ابواب میں جدید طرزِ زندگی اور نئے رشتوں کے کچھ اشارے بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کی اختیاری کہانی کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے انحطاط اور پسپائی تک ہی اپنی لکیر کھینچ چکا ہے اور کہانی کا بنیادی کردار وزیر بیگم، محل سراؤں سے نکل کر گلی کوچوں میں اپنے اچھے دن تلاش کر رہا ہے... یہ صرف ایک ہی عورت کی کہانی ہے جس نے مختلف مقامات پر اپنا کردار نبھاتے ہوئے سارے معاملات کو نازک اور نظر نہ آنے والے رشتوں میں جکڑ دیا ہے۔" ۴۷

شاہین مفتی کے اس بیان کے مطابق اس ناول میں صرف ایک فرد، ایک کردار کے حوالے سے ایک بڑے عہد کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی سروکاروں کو پیش کیا گیا ہے اور عہد بھی وہ جو "انحطاط پسپائی"، زوال اور المیے سے دوچار تھا۔ یہ اس دور کی حقیقت بھی ہے جسے شمس الرحمن فاروقی نے ناول نگاری میں زندہ کر دیا ہے۔ اس عہد کے بہت سے غلط اور مہلک اسباب جو معاشرے میں ناسور بن گئے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کا بھی سبب بنے اُن پر بات کرنے کے لیے علیحدہ دفتر درکار ہو گا۔ یہاں چیدہ چیدہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی تا کہ اُس عہد کی معاشرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ ناول میں پہلا المیہ تو یہ ہے کہ اس عہد میں نوابین نے شادی کے بغیر عورتوں کو اپنے گھر میں بیوی کی حیثیت سے رکھنے کے کلچر کو جو پروان چڑھایا وہ قابلِ اعتراض بات ہے۔ اگر نواب مر جائیں یا علیحدگی اختیار کریں تو عورت کو جائیداد میں سے کچھ نہیں ملتا تھا اور بچوں کی تربیت و نگہداشت کی فکر الگ تھی۔ قلعے میں کمزور بادشاہ کی سربراہی، انگریزوں کا اپنی سازشوں کے ذریعے سیاسی بساط چلانا، معاشرے کی انفعالی اور بے عملی کی کیفیت، انگریز خوش حال اور عوام بے حال، نوابین اور دیگر کرداروں کے یہاں خادموں کی جاسوسیاں، قلعے اور عوام کا مستقبل مسمار ہو کر حکمرانوں کے ہاتھوں انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔ یعنی زوال اور پسپائی کے یہ اسباب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے اسباب بنے۔ اس کے علاوہ ناول کی مرکزی کردار نے اپنے تئیں اپنے لیے اونچی مسند کا جو انتخاب اور انتظام کیا تھا اُس سے کہیں نیچے لڑھک گئی تھی۔ آخیر میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ:

> "کسی بھی عہد کے المیے اور زوال اس کے افراد اور حکمرانوں کی خطاؤں اور مہلک غلطیوں کے سبب جنم لیتے ہیں اور فرد کے المیے میں بے جا اور بے ضرورت آرزومندی اور تکبر کا دخل ہوتا ہے اور یہ حقیقت بہت سے نمایاں افراد کی الم ناک زندگیوں اور ملکوں کی سماجی، سیاسی اور ادبی تاریخ سے خوب عیاں ہے۔" ۴۸

اردو ادب کی کرداری ناول نگاری کی روایت میں معاشرتی عکاسی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس باب میں اب تک کے کیے گئے تنقید و تجزیہ سے یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ کسی بھی عہد کی معاشرت، تہذیب، تاریخ اور معاشی زندگی کے کرداروں پر خاطر خواہ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس مقالے میں اسی سے کرداروں کے حقیقی عہد، جذبات اور احساسات کا تعین کیا گیا ہے۔

سرشار نے فسانۂ آزاد میں اپنے دور کے زوال پذیر سماج کی عکاسی کی ہے۔ خوجی اور آزاد سرشار کے دو ایسے ابتدائی کردار ہیں جنھوں نے کرداری ناول نگاری کو زندہ کر دیا۔ انسانی سماج میں پائے جانے والے دو عوامل آئیڈیلزم (Idealism) اور رئیل ازم (حقیقت پسندی) پر ہماری ادبی تاریخ کی بنیاد ہے۔ فسانۂ آزاد میں حقیقت پسند معاشرتی کردار ہمارے سامنے آئے جنھوں نے اپنی قوم کی معاشرتی اور معاشی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ جس بنا پر فسانۂ آزاد کو لکھنو میں مخلوط ہو کر ایک دلچسپ معاشرتی کرداری ناول کا درجہ مل گیا۔

امراؤ جان ادا جیسے خوفناک، ماجرائی اور اغوا کار پہلو پر اردو ادب کی روایت آسودہ ہو گئی۔ آنے والی بیسویں صدی کے موڑ پر رسوا نے گزرے ہوئے دور کے درد کا ہلکا سا احساس دلایا اور زوال آمادگی اور معاشرتی برائیوں سے آنے والے معاشی بحران کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ امراؤ جان کا آئیڈیل کردار اپنے عہد کی معاشرتی برائیوں، کمزوریوں اور خاص طور پر اخلاقی کجی اور معاشرتی و تہذیبی سروکاروں کی عکاسی کر رہا ہے جو اُس تہذیب کا خاصا تھی۔

"کئی چاند تھے سر آسماں" تہذیب و تمدن، شعر و ادب، معاشرت کے آداب، عام زندگی کی جزئیات کے سچے اور زندہ بیان کی وجہ سے اردو ادب کی معاشرتی تاریخ میں اپنا لوہا منوا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے گہرے سماجی المیے کا حقیقت پسندانہ اظہار اس تاریخی و سوانحی شخصیت مرزا داغ کی والدہ وزیر خانم کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس پہلو دار اور حزنیہ کردار نے سماج اور ٹریجڈی کی بھینٹ چڑھ کر چار شوہر بھگتائے جنھیں بے وقت موت نے اس سے چھین لیا۔ وزیر خانم کے کردار کی جدت آمیز کھتونی اور فاروقی کی کوششیں معاشرتی کرداری ناول نگاری میں شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ یادگار سماجی کرداری اور روایتی ناول اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروز اللغات اردو جامع، لاہور، راولپنڈی، کراچی: فیروز سنز لمیٹڈ، س۔ن، ص: ۳۹۷

۲۔ www.google.com.pk/seareh?9=civilization 1022

۳۔ www.google.com.pk/search?9=culture

۴۔ فقر الکریم، ڈاکٹر، اردو ناول میں خاندانی زندگی، لکھنو: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۵۸

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

۵۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول، لاہور: ابلاغ، ۱۹۹۴ء، ص:۱۳۹
۶۔ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر، اردو ناول کے اسالیب، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص:۸۱۔۸۲
۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، لاہور:۔ فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء، ص:۲۰۶
۸۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: مکتبہ جدید پریس، ۲۰۰۶ء، ص:۳۳۲۔۳۳۳
۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، فسانۂ آزاد: تنقیدی تجزیہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء، ص:۶۱
۱۰۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، حیدر آباد: نیشنل بک ڈپو، ۱۹۷۳ء، ص:۲۰
۱۱۔ بحوالہ شہاب ظفر اعظمی، محولہ بالا، ص:۸۳
۱۲۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، فسانۂ آزاد، مشمولہ تنقیدیں، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۶۴ء، ص:۲۲
۱۳۔ خالد ندیم، ارشد نعیم، افسانوی نثر اور ڈرامہ، لاہور: عبداللہ برادرز، اردو بازار، س۔ن، ص:۱۶۱
۱۴۔ رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، جلد اول، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص:۵۸۶۔۵۸۷
۱۵۔ سرشار، فسانۂ آزاد، جلد دوم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص:۳۴۸
۱۶۔ احتشام حسین، سید، ذوقِ ادب اور شعور، لکھنو: فروغِ اردو، ۱۹۵۵ء، ص:۱۹۔۹۹
۱۷۔ خالد ندیم، ارشد نعیم، محولہ بالا، ص:۱۴۶
۱۸۔ مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر، ادب و آگہی، کراچی: مطبوعہ مکتبہ افکار، س۔ن، ص:۲۰
۱۹۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، دیباچہ، ظہیر فتح پوری، لاہور: مطبوعہ مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۸ء، ص:؟
۲۰۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو ادب کے افسانوی اسالیب، اسلام آباد: ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۰۷ء، ص:۷۵
۲۱۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص:۶۷۔۷۷
۲۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی مختصر تاریخ، لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۹
۲۳۔ ہادی رسوا، مرزا، محولا بالا، ص:۱۰۰
۲۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری: اردو ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۹۶ء، ص:۴۸
۲۵۔ ایضاً، ص:۱۶۳
۲۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول، تنقیدی مطالعہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۹
۲۷۔ خالد ندیم، ارشد نعیم، حولہ بالا، ص:۲۵۳
۲۸۔ میمونہ انصاری، ڈاکٹر، امراؤ جان ادا، مشمولہ صحیفہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص:۵۲
۲۹۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، امراؤ جان ادا، مشمولہ تنقیدیں، طبع اول، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۷ء، ص:۲۱۸
۳۰۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص:۱۰
۳۱۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء، ص:۹۶
۳۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول۔ کرداروں کا حیرت کدہ، لاہور: فضلی سنز، ۲۰۱۵ء، ص:۴۱
۳۳۔ مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص:۳۲
۳۴۔ احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص:۲۱۳
۳۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی: دی سمیع سنز پرنٹرز، ۲۰۰۶ء، ص:۸۲۴
۳۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول۔ کرداروں کا حیرت کدہ، حوالہ مذکور، ص:۴۳
۳۷۔ علی حیدر ملک، پروفیسر، کئی چاند تھے سر آسماں پر ایک نظر، مشمولہ، ادبی مصروفیات، ۲۰۰۶ء، ص:؟
۳۸۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول۔ کرداروں کا حیرت کدہ، محولہ بالا، ص:۴۴۔۴۵
۳۹۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، آزادی کے اردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص:۴۱۷۔۴۱۸
۴۰۔ شمس الرحمن فاروقی، حوالہ مذکور، ص:۵۶۱

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

۴۱۔ ایضاً، ص:۵۸۸

۴۲۔ ایضاً، ص:۶۰۷

۴۳۔ ایضاً، ص:۸۲۲

۴۴۔ ایضاً، ص:۸۲۲

۴۵۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، اردو ناول کرداروں کا حیرت کدہ، حوالہ مذکور، ص:۴۶۔۴۷

۴۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص:۲۸

۴۷۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، مضمون، شمس الرحمن فاروقی کی بنی ٹھنی، سہ ماہی: آئندہ، کراچی: ۲۰۰۶ء، ص:۴۷

۴۸۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، محولہ بالا، ص:۲۹